ڈاکٹر جمیل جالبی.....تعلق اور تحقیق کی خوشبو

ڈاکٹر زاہد منیر عامر
پروفیسر و صدر شعبہ اردو،
پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، لاہور۔ پاکستان

ABSTRACT:

Dr Jamil Jalibi (1929-2019) is a well-known writer, literary historian and critic. There are over thirty books on these genres, to his credit. He wrote a matchless History of Urdu Literature and edited a legendary literary magazine, *Naya Daur*, for many years. In this article, the author has remembered him, through his personal reflections. Unpublished letters of Dr Jamil Jalibi, addressed to the author, have also been produced here. These letters not only express his sentiments towards his addressee but also reflect his own personality through the words of affection and literature. Questions raised by the author are also answered by the literary genius. Issues requiring explanations have been expounded on, in the endnotes.

Keywords: Dr Jamil Jalibi, unpublished letters, Nizami Dakni, modern criticism, *History of Urdu Literature*, Poetics, First literary book of Urdu literature.

انھیں میرے متعلق ہی نہیں ہر ایک کے متعلق عام طور پر معلوم ہوتا تھا کہ وہ کون ہے، کیا ہے، اس کا خاندان کہاں سے متعلق ہے، اس کی دادی کے کتنی مرتبہ آپریشن ہوا تھا، اس کی نانی کی موت کس

مرض میں واقع ہوئی تھی اوراس کے ایک خالوکوکس جرم میں حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی، یہ مقدمہ کن عدالتوں میں رہا،کس کس وکیل نے کیا جرح کی وغیرہ وغیرہ............

یہ تو دادا کا حال تھا، پوتے کا حال یہ تھا کہ اسے اپنے ذہن پر کسی غیرضروری یادداشت کا بار ڈالنا تک گوارانہ تھا۔ وہ اتنا عملی انسان تھا کہ اسے اگر کسی کا ٹیلی فون نمبر بھی یاد ہوجاتا تو وہ کوشش کر کے اسے بھلا دیتا تھا تا کہ ذہن کی اس جگہ میں کسی کام کی بات کو رکھا جائے، ٹیلی فون نمبر تو ایک ڈائری بھی یادرکھ سکتی ہے۔ جالبی صاحب نے مجھ سے یہ بات اس وقت کہی جب موبائل ٹیلی فونوں نے فون نمبر یادرکھنے کا کام نہیں سنبھالا تھا۔آغازِ کلام کی سطورشوکت تھانوی کی ہیں جنھوں نے شیش محل میں جالبی صاحب کے دادا کے بھائی جالب دہلوی کا خاکہ اڑایا ہے۔اس خاکے کو پیش نظر رکھیں تو جالب اور جالبی میں ایک اورفرق بھی معلوم ہوتا ہے......بہت بڑافرق۔دادا کا عالم یہ تھا کہ کسی نے سوال کیااور وہ جھاڑ کا کانٹا بنے۔ان کے بے پناہ علم اور تجربے کا دریا بہتار ہتا یہاں تک کہ سائل اپنے سوال پر پچھتا تا ہوا غائب ہوجاتا۔جالب دہلوی کے برعکس جالبی صاحب کا یہ عالم تھا کہ سوال کے بقدر جواب ملتا۔گنے چنے الفاظ،جونہایت سلیقے سے سوچ سمجھ کرادا کیے جاتے اور سائل کے پاس اگرمزید سوال نہ ہوتا تو جواب کی تکمیل پر گویا اسے رخصت کی اجازت مل جاتی۔ان کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ان کے کاموں کی فہرست اوران کی مصروفیات کی جانب دیکھیں تو معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سب کام ایک شخص نے کیے ہیں۔ایک تاریخ ادب اردو ہی کو لیجیے۔جس میں انھوں نے دکنی ادب سے انیسویں صدی تک کے زمانے کا احاطہ،اپنے کام کو بنیادی ماخذ پر استوار کر کے کیا ہے۔جس کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ ادب اگرزندگی کا آئینہ ہےتو ادب کی تاریخ کو بھی اس دور کے ادب کا آئینہ ہونا چاہیےاور آئینہ بنانے کے لیےضروری ہے کہ پوری تہذیب، پوری تہذیبی تاریخ، اپنے سارے رجحانات، اپنے سارے میلانات کے ساتھ ادب کی تاریخ میں آجانی چاہیے تا کہ جب آدمی تاریخ پڑھےتو اس دور سے بھی پوری طرح واقف ہوجائے۔اردوادب کی جتنی تاریخیں لکھی جاچکی ہیں ان میں اگرکوئی تاریخ اس تعریف پر پوری اترتی دکھائی دیتی ہےتو وہ جالبی صاحب ہی کی تاریخ ہے۔صرف تاریخ ادب اردونہیں،قدیم دکنی مخطوطات سےتعلق،مثنوی کدم راؤ پدم راؤ جیسےمشکل متن کی تدوین(۱۹۷۳ء)دیوان حسن شوقی (۱۹۷۱ء)دیوان نصرتی (۱۹۷۲ء)قدیم اردو کی لغت (۱۹۷۳ء)

قومی انگریزی اردولغت (۱۹۹۲ء)فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ کی دوجلدیں(۱۹۹۱ء،۱۹۹۳ء)ایلیٹ کے مضامین کاترجمہ(۱۹۶۰ء)،میراجی جیسے شاعر کے متن کی جمع آوری (۱۹۸۹ء) راشداورمیراجی جیسے جدید تر شاعروں کے فن اور شخصیت کا مطالعہ (۱۹۸۶ء،۱۹۹۰ء)۔مغرب کی ڈھائی ہزارسالہ ادبی تاریخ کے شاہ کارمضامین کاترجمہ ارسطو سے ایلیٹ تک (۱۹۷۵ء) تنقیداور تجربہ(۱۹۶۷ء)نئی تنقید(۱۹۸۵ء) ادب، کلچراورمسائل (۱۹۸۶ء) محمد تقی میر (۱۹۸۱ء)معاصرادب(۱۹۹۱ء)قلندر بخش جرات (۱۹۹۰ء)جیسے تنقیدی مضامین کے مجموعے،ساقی میں کالم نگاری اور نیادور جیسے ادبی جریدے کی ادارت اوران سب کے ساتھ انتظامی مصروفیات۔وہ بھی کیسی؟ کمشنر انکم ٹیکس ،کراچی یونی ورسٹی کی وائس چانسلری،مقتدرہ قومی زبان کی سربراہی ......اللہ اللہ ایک انسان تھا یا انسانوں کی کوئی جماعت جس نے مل کر یہ سب کارنامے انجام دیے......؟ایک ایسے دور میں جب ادب کی لگن عام نہ ہواور معاشرہ محض مادی مفادات کے پیچھے بھاگ رہاہو، ملازمتیں تو خیر ضرورت کے تحت کی جاتی ہیں لیکن ایسے علمی وتنقیدی کام جن کے ساتھ کوئی مادی مفادبھی وابستہ نہ ہو، ذوق وشوق کے بغیر ممکن نہیں فقط ذوق وشوق کی بنا پر اتنے کاموں کا انجام دینا معمولی بات نہیں۔ممتاز مفتی نے درست کہا تھا کہ ان کے کاموں کی فہرست مور کی دم کی طرح اتنی لمبی اور بھڑکیلی ہے کہ ساری توجہ دُم ہی پر مرکوز ہوکر رہ جاتی ہے اوران کی شخصیت نظرانداز ہوجاتی ہے۔[1] خوبیِ قسمت سے، راقم کو، جالبی صاحب کے کاموں ہی سے نہیں ان کی شخصیت سے بھی تعارف کا موقع ملا۔ایک باران سے ان کے کاموں اور کامیابیوں کا راز دریافت کیا تو کہنے لگے: میں نے دیکھا ہے کہ زندگی میں اگر آدمی کے پاس دس فیصد ذہانت ہواور وہ نوے فیصد محنت کرسکتا ہوتو کامیابی کے لیے اتنا کافی ہے۔

محمد جمیل خان، یوسف زئی پٹھان تھے ان کا ددھیال میرٹھ اورننھیال سہارنپور کا تھے۔وہ دس بہن بھائیوں میں پہلوٹھی کے تھے۔والدہ شعر کہتی تھیں، والدانھیں ادب سے دوررکھنا چاہتے تھے۔ان کی شخصیت میں یہ دونو رویّے جمع ہوگئے۔شروع میں شعر کی طرف مائل ہوئے لیکن پھرانھوں نے خودکو دریافت کرلیا لیکن یہ عمل خاصا طویل ثابت ہوا۔انگریزی، فارسی اوراردو میں ایم اے کیا، قانون کی ڈگری حاصل کی، سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا،، پی ایچ ڈی کی، ڈی لٹ کی ڈگری ملی......اس سارے سفر میں

ادب ان کی پہلی اور آخری محبت ثابت ہوا۔ اردو ادب کی خوش قسمتی کہ انگریزی ادب کا یہ طالب علم اس کی جانب متوجہ ہوا جس نے اردو کے دامن کو کلاسیکیت ہی سے نہیں جدید مغربی سرمائے سے بھی ثروت مند کیا۔ انھیں اسکول میں داخلے کے لیے لے جایا گیا تو کم عمری کی بنا پر داخلہ نہ ملا۔ اگلی بار والد انھیں علی گڑھ کٹ پاجامہ، شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنا کر لے گئے تو عمر میں بڑے نظر آنے لگے اور داخلہ مل گیا ۔انھوں نے عملی زندگی کا آغاز بھی ایک اسکول کی ملازمت سے کیا لیکن اپنے اسی اصول کی بنا پر جس کا سطور ماقبل میں ذکر ہوا ترقی کرتے کرتے وائس چانسلری تک پہنچے۔

راقم کے دور طالب علمی کی بعض کتب ان سے اوّلین رابطے کا ذریعہ بنیں۔ یہ ۱۹۸۹ء کی بات ہے۔ انھوں نے راقم کی طالب علمانہ کاوشوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے انھیں فکر اور فلسفہ کو عہد حاضر کے حوالے سے ادب کا حصہ بنانے کی قابل تعریف کوشش قرار دیا۔ جس سے کم عمر مصنف کا حوصلہ بڑھا لیکن ان سے پہلی بار ملاقات کا موقع ۱۹۹۱ء میں ملا۔ وہ اس زمانے میں مقتدرہ قومی زبان کے سربراہ تھے۔ اپنے کسی سلسلے میں لاہور تشریف لائے۔ عزیز جاپانی دوست سویا مانے ، نے کہا کہ جالبی صاحب آرہے ہیں ملنے چلیں گے.....؟ میں بخوشی تیار ہو گیا۔ ادبی کتب کے مشہور اشاعتی ادارے سنگ میل پبلشرز پر ہماری پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ ایک موٹی سی کتاب ہاتھ میں لیے کہہ رہے تھے کہ کلیات جعفر زٹلی بھی اسی انداز سے شائع ہونی چاہیے۔ انھیں جعفر زٹلی کے کلام سے خاص دلچسپی تھی۔ انھوں نے اس کے کلام کے کئی نسخے جمع کر رکھے تھے، لندن سے ایک مائیکرو فلم بھی منگوائی تھی۔ تاریخ ادب اردو کی دوسری جلد میں انھوں نے اس پر جو کچھ لکھ دیا ہے وہ شاید کہیں اور نہیں ملے گا۔ ان کے بہ قول جعفر، ذہین، طباع، تیز مزاج، حاضر جواب اور اکڑفوں والے انسان تھے۔ زبان میں ایسی کاٹ کہ جس پر چل گئی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ قادرالکلام ایسا کہ جس بات کو جس طرح چاہا ادا کر دیا، قوتِ اختراع ایسی کہ اظہارِ بیان کے لیے بے شمار نئے الفاظ و تراکیب وضع کر ڈالیں۔ ان کے مطابق جعفر زٹلی ایک ایسا منفرد شاعر ہے جس کے کلام سے اس دور کے نہ صرف حالات و عوامل کا پتہ چلتا ہے بلکہ معاشرتی و تہذیبی گراوٹ اور سیاسی و اخلاقی زوال کے بنیادی اسباب کا بھی پتا چلتا ہے۔ جعفر نے غزل کو اپنے اظہار کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اپنے مخصوص مزاج کی تندی و تیزی، راست بازی و حق گوئی کے باعث بے باکی کے ساتھ ایسی نظمیں لکھیں جن کے احاطہء اثر میں سارا معاشرہ آ گیا۔ جعفر کے ان اوصاف کے باوصف ادب کا عام قاری اسے فحش نگار یا ہزل گو سے زیادہ کوئی

حیثیت نہیں دیتا۔[۲] سنگ میل کے مینیجنگ پارٹنر غالباً اعجاز مرحوم نے جعفر زٹلی جیسے شاعر کے کلام کی اشاعت کی راہ میں حائل سماجی عوامل کا ذکر کیا تو جالبی صاحب کہنے لگے کہ ایک پٹی چھاپ کر اس پر لپیٹ دی جائے جس پر لکھا ہو ''صرف محققین کے لیے''۔

اس ملاقات کی یاد کچھ تصویروں کی شکل میں اب تک محفوظ ہے۔ان کا تاریخ ادب کا منصوبہ جاری تھا، پہلی دو جلدیں چھپ چکی تھیں اور ہم ادب کے طالب علم کے طور پر انھیں دیکھ کر مبہوت ہوتے رہتے تھے۔میں نے انھیں بتایا کہ میں دیوان میر سوز کے ایک خطی نسخے پر کام کر رہا ہوں۔اس کام کے دوران مجھے ۱۲۷۲ھ کی مکتوبہ ایک بیاض ملی ہے۔اس بیاض میں میر سوز کا انتخاب بھی ہے۔بیاض خاصی قیمتی ہے اور اس میں سوز کے علاوہ نیاز، قدسی، امیر خسرو اور سودا کا کلام بھی موجود ہے۔انھوں نے میری باتوں میں دلچسپی لی اور میری اس خواہش پر کہ وہ کچھ وقت نکال کر یہ بیاض دیکھ لیں، مثبت ردعمل ظاہر کیا۔یہی نہیں وہ سچ مچ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری تشریف لے گئے اور انھوں نے اس بیاض کو ملاحظہ فرمایا اور واپس اسلام آباد جا کر مجھے اس بیاض کے بارے میں ایک مفصل خط تحریر فرمایا۔یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔اس خط کے بعد ان سے مزید خط کتابت ہوئی۔بیاض سے متعلق انھوں نے جس دلچسپی کا مظاہرہ کیا اس سے حوصلہ پا کر میں نے انھیں کراچی کے اردو لغت بورڈ کی لائبریری میں محفوظ ایک اور خطی نسخے کی جانب متوجہ کیا۔انھوں نے اس پر بھی کمال مہربانی کا مظاہرہ کیا اور اپنے دورۂ کراچی کے دوران اردو لغت بورڈ کی لائبریری میں تشریف لے گئے اور میرے نشان دادہ خطی نسخے کو دیکھ کر اس کی تاریخ کتابت کے بارے میں مجھے خط لکھا۔اس نسخے کے کاتب کا نام سید میر تھا جس سے گمان ہوتا تھا کہ شاید یہ میر سوز کا اپنا کتابت کردہ نسخہ ہو کیونکہ راقم میر سوز کے ایک دستخطی نسخے سے واقف اور اس کی جستجو میں تھا اس لیے جالبی صاحب سے دریافت کیا کہ کہیں یہ وہی نسخہ تو نہیں ہے جس پر انھوں نے لکھا کہ وہ نسخہ میر سوز کا لکھا ہوا نہیں ہے۔مزید معلومات کے لیے انھوں نے لغت بورڈ کی لائبریرین سے میرا رابطہ کروا دیا۔یہ وہ دن تھے جب وہ ماریشس کی عالمی اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے پاکستانی وفد کے ساتھ ماریشس جا رہے تھے۔

راقم نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تو انھوں نے اس پر مبارک باد کا خط لکھا اور دعاؤں سے نوازا۔ایچی سن کالج سے متعلق راقم کی یادنگاری کی حوصلہ افزائی کی اور رسالے میں چھپنے والے اس مضمون کو ایسا مربوط قرار دیا جس میں کسی قسم کے اضافے کی ضرورت نہیں انھوں نے اس کام میں تحقیق کو تخلیق سے

آمیز پایا اور اسے جلد کتابی صورت میں شائع کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ راقم کی تحریروں کو خواہ وہ نظم ہوں یا نثر دل چسپی سے پڑھتے اور اسے اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازتے تھے۔ راقم نے ان سے اپنے شعری مجموعے پر پیش لفظ لکھنے کی فرمائش کی تو انھوں نے اسے بہ کمال محبت پورا کیا اور ''تقریش'' کے عنوان سے ایک حوصلہ افزا پیش لفظ تحریر فرمایا حالانکہ ان دنوں وہ بہ قول خود'' تاریخ ادب اردو کی تیسری جلد میں دھنسے ہوئے تھے۔'' راقم کی کتاب تاریخ جامعہ پنجاب شائع ہونے کی خبر ان تک پہنچی تو انھوں نے اسے پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا اور پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر سے اس کا ایک نسخہ حاصل کرنے کی گزارش کی۔ وہ راقم کے ساتھ کیسا اخلاص رکھتے تھے اس کا اندازہ ان کی ان دعاؤں سے کیا جا سکتا ہے جو راقم سطور کے لیے ان کے قلم سے تراوش ہوئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بس کام میں لگے رہیے اور اچھے اچھے کام کرتے رہیے آپ سے بڑی امیدیں ہیں ان شاء اللہ کامیاب ہوں گے۔ شکر ہے کہ وہ نہ صرف تیسری جلد مکمل کر سکے بلکہ انھوں نے اپنے منصوبے کی چوتھی جلد بھی مکمل کی۔ چار ہی جلدیں ان کے پیش نظر تھیں یہ الگ بات کہ چوتھی جلد انیسویں صدی پر ختم ہوگئی اور بیسویں صدی کے ہنگامہ خیز دور کا احاطہ نہ ہو سکا۔ جب وہ مقتدرہ میں تھے تو اس زمانے میں انھوں نے پاکستان ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام'' گیسٹ آور'' میں فرمایا تھا کہ میں اب تاریخ ادب کو مکمل کرنے کے لیے مقتدرہ سے جانا چاہتا ہوں کیونکہ میرے حساب سے اگر میں دن رات کام کروں تو بقیہ دو جلدوں کے لیے مجھے چودہ سال درکار ہیں، عمر تو ماشا اللہ بڑھ رہی ہے، قیامت کے بورے کس نے سمیٹے ہیں۔ یہ بات ۲۵ ستمبر ۱۹۹۴ء کی ہے۔ اس وقت وہ پینسٹھویں برس میں تھے۔ وہ مزید چودہ برس کے حساب سے اناسی برس کو بھی زیادہ خیال فرما رہے تھے۔ اللہ نے انھیں نوے برس دیے۔ آخری چند برسوں کی شدید علالت کو نکال دیا جائے تو بھی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اس مہلت کا کوئی حصہ ضائع نہیں کیا۔

افسوس کہ ان کے ساتھ مراسلت طویل وقفوں کا شکار رہی۔ ملاقاتوں کا آغاز تو جیسا کہ عرض کیا گیا، ایم اے کے زمانہ طالب علمی میں ہوا لیکن ان میں اضافہ اس وقت ہوا جب راقم اسلام آباد میں مقیم ہوا۔ جالبی صاحب کی مقتدرہ قومی زبان کی صدر نشینی کا زمانہ چل رہا تھا۔ ایک بار انھوں نے فون کر کے مجھے بلوایا۔ انھیں معلوم تھا کہ میں ایم اے کر چکا ہوں اور کسی معقول ملازمت کی تلاش میں ہوں۔ کہنے لگے کہ مجھ سے ریڈیو پیکنگ والوں نے رابطہ کیا ہے، انھیں اپنی اردو سروس کے لیے آپ جیسے کسی

نوجوان کی ضرورت ہے۔ کیا آپ چین جانا پسند کریں گے.....؟ میں نے سوچنے کے لیے کچھ مہلت طلب کی جوانھوں نے بخوشی دے دی اور کہا ٹھیک ہے جب آپ مجھے جواب دیں گے تو میں انھیں بتاؤں گا ۔ کچھ دنوں کے بعد ان کے دفتر سے وقت لے کر میں جب ان کی خدمت میں حاضری کے لیے جارہا تھا تو میرا مستعار اور بیمار موٹر سائیکل راستے میں خفا ہو گیا۔ بہت منانے کے باوصف نہ مانا جس کے باعث میں مقررہ وقت پر ان کے دفتر نہ پہنچ سکا۔ جب میں ان کے پی اے کے پاس پہنچا تو مجھے بے اعتنائی کا احساس دلایا گیا۔ پی اے نے کہا جالبی صاحب کو کہیں جانا تھا وہ آپ کا انتظار کر کے چلے گئے ہیں لیکن اس کے انداز سے یوں لگتا تھا جیسے وہ سچ نہیں بول رہا اور جالبی صاحب اپنے دفتر میں موجود ہیں۔ میں دفتر کے ماحول کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ مایوس ہو کر واپس آ گیا۔ اس کے بعد بار دگر جب جالبی صاحب سے ملاقات کا وقت طے ہوا تو خوبی قسمت سے راستے کی کوئی مشکل رکاوٹ نہ بنی اور میں وقت مقررہ پر ان کے دفتر پہنچ گیا۔ کہنے لگے اس روز میں دانستہ آپ سے نہیں ملا۔ اس طرح میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ انسان کی زندگی میں ایک وقت آتا ہے جب دوسرے اس کا انتظار کرتے ہیں۔ اس وقت کے آنے سے پہلے اسے دوسروں کا انتظار کرنا ہوتا ہے.....ان کی یہ بات زندگی کے تجربے پر مبنی تھی یوں بھی وہ ایک سینئر اور بزرگ شخصیت تھے اور راقم ایک خورد اور تازہ تازہ ایم کرنے والے ایک نوجوان کی حیثیت سے ملازمت کا جویا.....لہٰذا میں نے ان کے اس رویے کو درست سمجھا۔

چین کی پیش کش کے حوالے سے میں کچھ ایسی مثالوں پر غور کرتا رہا تھا جنھوں نے اپنے کیریر کے اوائل میں بیرون وطن کا سفر اختیار کیا، جب واپس آئے تو کسی ادارے سے وابستہ ہونے کی عمر سے گزر چکے تھے اس لیے وہ زندگی بھر ادھر ادھر گردش کرتے رہے اور جم کر کسی ادارے کی خدمت نہ کر سکے۔ دوسرے مجھے یہ خیال بھی تھا کہ اگر میں ابھی وطن سے باہر چلا گیا تو میرے باطن میں اپنے وطن کے لیے جو جذبات ہیں جن کا اظہار میں اپنی دور طالب علمی کی تصانیف اور خاص طور پر لمحوں کا قرض میں بھی کر چکا تھا، ان کے بروئے کار آنے کی کوئی صورت نہ رہے گی اور میری توانائیوں کا زمانہ دیارِ غیر ہی میں گزر جائے گا۔ میں نے اپنے یہ تمام احساسات جالبی صاحب کے سامنے رکھ دیے۔ وہ میرے خیالات جان کر نہایت خوش ہوئے اور میرے انکار سے آزردہ ہونے کے بجائے کہنے لگے بالکل درست ہے آپ کو اسی طرح سوچنا چاہیے۔ اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو اس مرحلے پر میں بھی باہر جانا قبول نہ کرتا،

ٹھیک ہے میں ان لوگوں کو آپ کے انکار سے آگاہ کر دوں گا۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب مرحوم ومغفور مقتدرہ میں ان کے پیش رو تھے۔ وہ بڑے مردم شناس، صاحب علم اور فعال شخصیت کے مالک سربراہ تھے۔ غضب کا حافظہ پایا تھا ایک بار جس سے مل لیتے وہ ہمیشہ کے لیے ان کے حافظے کی تختی پر محفوظ ہو جاتا۔ جس شخص میں کوئی صلاحیت دیکھتے اسے اس کے حسبِ حال کام پر لگا دینا چاہتے۔ راقم نے اپنے دور طالب علمی میں مولانا ظفر علی خان کے خطوط کا اوّلین مجموعہ مرتب کیا تھا یہ مجموعہ ان کی نظر سے گزرا تو انھوں نے باوجود یکہ راقم ابھی کالج کا ایک کم سواد طالب علم تھا اس سے مولانا ظفر علی خان کی کتابیات تیار کرنے کی فرمائش کی۔ یہ ملاقات مقتدرہ قومی زبان کے لاہور آفس میں، جو اس زمانے میں ریوازگارڈن میں تھا، ہوئی (اب تو مقتدرہ اور اور اس کا لاہور آفس دونو مرحوم ہو چکے) اس ملاقات میں ڈاکٹر انور سدید مرحوم بھی شریک تھے بلکہ وہی مجھے ڈاکٹر صاحب سے ملوانے کے لیے لے گئے تھے۔ میں نے ہامی بھر لی اور کچھ ہی دن میں کتابیات کا مسودہ تیار کر کے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھجوا دیا لیکن اس کی اشاعت میں اس قدر تاخیر ہوئی کہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا دور ختم ہو گیا اور جالبی صاحب مقتدرہ کے سربراہ بن کر آ گئے۔ انھوں نے اپنے پیش رو کے کیے ہوئے معاہدوں اور منصوبوں کو جاری رکھا۔ یوں ان کے عہد میں میری مرتب کردہ کتابیات مقتدرہ سے شائع ہوگئی۔[۳] میرے لیے خاص بات یہ تھی کہ جالبی صاحب نے اس کتابیات پر پیش لفظ بھی لکھا۔ انھی کے دستخطوں سے مجھے حق تصنیف کا چیک ملا۔ ان کے اس اندازِ کار کے باوصف ڈاکٹر وحید قریشی صاحب ان سے کچھ نالاں ہی رہتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ تاریخ ادب اردو کا کام میرے گھر بیٹھ کر افسر صدیقی نے کیا ہے۔ یا پھر یہ فرمایا کرتے تھے کہ قومی انگریزی اردو لغت کا سارا منصوبہ میں بنا کر آیا تھا جالبی صاحب نے اس پر اپنا ٹھپا لگا کر چھاپ دیا در آنحالیکہ جالبی صاحب کا کہنا تھا کہ انھوں نے زندگی میں بہت محنت کی ہے لیکن اتنی کسی منصوبے پر نہیں کی جتنی انگریزی اردو لغت پر ہوئی ہے۔'' اگر کام کرنے کے گھنٹوں کو شمار کیا جائے اور ان راتوں کو بھی جن میں یہ کام ہوا تو اس پر کم وبیش دس سال کے برابر عرصہ لگا ہے ویسے یہ کام تقریباً ساڑھے تین سال میں بفضل تعالیٰ پایہ تکمیل کو پہنچا ہے''[۴] وغیرہ وغیرہ۔ عربی میں کہا جاتا ہے کہ من صنف فقد استہدف جو تصنیف کرتا ہے وہ دوسروں کے اعتراضات کا ہدف بھی بنتا ہے۔ اگر کوئی شخص دس ریسرچ اسسٹنٹ رکھ کر بھی تاریخ ادب اردو ایسی کتاب لکھ دے تو اسے

سرآنکھوں پر بٹھانا چاہیے۔کچھ ایسے ہی اعتراضات بعض دوسرے اصحاب کی جانب سے بھی سننے میں آئے۔ایک بار ڈاکٹر وزیر آغا نے راقم سے کہا کہ ایک اہل قلم کانفرنس میں دو دو ادیبوں کو ایک کمرے میں ٹھہرایا جارہا تھا۔جب مجھ سے پوچھا گیا کہ میں کس کے ساتھ رہنا چاہوں گا تو میں نے جالبی صاحب کا نام لیا۔ان دنوں میں کلچر کے بارے میں پڑھ رہا تھا اور جالبی صاحب کی اس سے پہلے اسی موضوع پر اردو اور انگریزی کتب شائع ہو چکی تھیں۔اردو میں ان کی کتاب پاکستانی کلچر:قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ [۵] اور انگریزی میں [۶] *Pakistan the Identity of Culture* اور *Pakistani Culture* شائع ہو چکی تھیں۔وہ عزیز احمد کی کتاب *Islamic Culture* کا اردو ترجمہ برصغیر میں اسلامی کلچر [۷] کے نام سے کر چکے تھے۔انھیں پاکستانی کلچر پر ۱۹۶۵ء کا داؤد ادبی انعام بھی مل چکا تھا۔میں ان کے ساتھ غرفہ نشیں ہوا تو میرے ذہن میں بہت سے مباحث اور سوالات تھے لیکن افسوس کہ وہ کلچر سے متعلق کسی بھی موضوع پر بات نہ کر سکے اور مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ڈاکٹر وزیر آغا سے یہ بات سننے کے بعد راقم نے کلچر سے متعلق جالبی صاحب کی کتب دیکھیں۔پاکستانی کلچر کو اچھی خاصی فکر انگیز کتاب پایا۔جس میں مصنف نے بڑی آزادہ روی سے بہت اہم موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔اختر حسین رائے پوری کی یہ رائے کہ یہ کتاب اس مشکل مسئلہ پر مدلل اور تفصیلی بحث کرتی ہے اور خیال و اظہار کی آزادی کی قابل تعریف مثال ہے،قابل توجہ معلوم ہوئی۔مصنف کا کہنا ہے کہ اس نے اس کتاب کو لکھنے سے پہلے اور لکھتے وقت بہت دکھ اٹھائے اور اس بے چینی کو پایا جو اس کے خیال میں اچھے ادب کی عطا ہوتی ہے۔مصنف نے اپنے مآخذ کا اعتراف فراخ دلی سے کیا ہے اور اپنے قاری کو بتا دیا ہے کہ ''یوں تو میں نے اس کتاب کے لکھنے میں متعدد کتابوں سے استفادہ کیا ہے لیکن خاص طور پر سائنس آف کلچر کے تیرھویں باب سے اپنی کتاب کے چھٹے باب کو اور کلچر اینڈ ہسٹری کے چوتھے اور پانچویں باب سے اپنی کتاب کے دوسرے باب کے ایک حصے کو سجایا ہے [۸] عزیز احمد (م:۱۶/دسمبر ۱۹۷۸ء) کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ برصغیر میں اسلامی کلچر دیکھنے سے بھی مصنف کے ہاں اس موضوع سے لگن کا احساس ہوا۔یہی نہیں انھوں نے عزیز احمد کی ایک اور کتاب *Islamic Modernism* کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالا جو برصغیر میں اسلامی جدیدیت کے نام سے شائع ہوئی [۹]۔ان دونو کتابوں کی جانب متوجہ

ہونے اور ترجمے کے لیے منتخب کرنے کے پس پردہ مترجم کا یہ احساس ہے کہ ہم زندگی کو آگے بڑھانے والے بڑے اور بنیادی سوالوں سے غافل ہو کر صرف عظمتِ رفتہ کے خواب دیکھنے میں مصروف ہیں۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ہم اپنے عمل سے ناانصافیوں کو قائم اور قرآن کی نفی کر رہے ہیں۔ اسی تاریخی شعور کے فقدان کی وجہ سے ہم اسلام جیسی متحرک و نامیاتی قوت کو آگے بڑھنے والی زندگی کے بڑے دھارے سے کاٹ کر اسے منجمد کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ عزیز احمد کی یہ دونو کتابیں مطالعہ تاریخ کے ذریعے ہمیں اپنے افکار و اقدار کا جائزہ لینے پر اکساتی ہیں اور ہمارے اندر سوئے ہوئے تاریخی شعور کو بیدار کرتی ہیں[10] سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جالبی صاحب کا اس موضوع سے اتنا گہرا تعلق تھا تو ڈاکٹر وزیر آغا جیسے جینوئن نقاد کے ہاں اس احساس نے کیوں جنم لیا جس کا سطور بالا میں ذکر ہوا؟۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ جالبی صاحب محنت اور مطالعے کی مدد سے تصنیف کا ملکہ رکھتے تھے لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر مصنف اپنے موضوعات پر بات بھی کر سکتا ہو (اگرچہ آئیڈیلی ایسا ہونا چاہیے) یوں بھی جالبی صاحب کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ تقریر کے آدمی نہیں تھے۔ کراچی یونی ورسٹی کی وائس چانسلری کے دوران بھی وہ ہمیشہ لکھی ہوئی تقریر پڑھا کرتے تھے[11] یہی نہیں کہ وہ تقریر کے آدمی نہیں تھے بلکہ بہ قول خود تقریب کے بھی آدمی نہیں تھے ان کا کہنا تھا کہ لوگوں کی مہربانی ہے کہ مجھے بلاتے ہیں، منصب صدارت پر بٹھانے کے خواہاں ہوتے ہیں، میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور پھر معذرت کر لیتا ہوں کہ میں تقریب کا آدمی ہی نہیں ہوں[12] وہ تقریر اور تقریب کے آدمی نہیں تھے لیکن اس کے باوصف وہ تقریر اور تقریب دونو کو نبھانا جانتے تھے اور اس میں کیا شبہ ہے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے منتظم تھے۔

ان کی تحریروں میں یہ احساس جھلکتا دکھائی دیتا ہے کہ آزادی کے بعد سے کسی شعبہ زندگی میں ہم نے کوئی عظیم ہستی پیدا نہیں کی اور نہ کوئی قابل فخر عظیم کارنامہ انجام دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہم ذہنی قیادت کے لیے صرف اور صرف دوسری اقوام کی طرف دیکھنے اور ان پر تکیہ کرنے کی خدمت ضرور انجام دے رہے ہیں[13] اس صورت حال کا باعث ان کے خیال میں یہ ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام انسانی نفسیات کے مسلمہ اصولوں سے منحرف اور ان بنیادوں سے محروم ہے جن پر اسے استوار ہونا چاہیے تھا۔ جس کا ایک نتیجہ معاشرے میں عوام اور خواص کے الگ الگ طبقات میں تقسیم ہو جانے کی صورت میں نکلا ہے۔ عوام یعنی مزدور، کسان، کلرک، فقیر، بھکاری اور رعیت اور خواص جن میں زمیندار، جاگیردار، سردار، سائیں اور

دولت مند طبقہ شامل ہے یہی ملک کے اقتدار و وسائل پر قابض ہیں۔ جالبی صاحب کہتے ہیں کہ زمینیں ان کی ملکیت ہیں، تجارت وصنعت ان کے تصرف میں ہے، سرکاری ملازمتوں کی صورت میں اختیار کی کنجیاں ان کے پاس ہیں، قانون ساز اداروں میں وہی عوام کے نمائندہ ہیں۔[۱۴] ایسے میں عوام جبر واستحصال کا شکار ہیں، انصاف اور اہلیت کا تصور بے معنی ہوگیا ہے۔ آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور مسائل کی شدت اس انقلاب کی راہ ہموار کر رہی ہے، جسے صرف اور صرف حقیقی انصاف ہی کے ذریعے روکا جاسکتا ہے[۱۵] ان کے خیال میں طبقات کی باہمی خلیج اتنی گہری ہے کہ خواص کا تعلیم یافتہ طبقہ خود کو اس معاشرے میں اجنبی محسوس کرتا ہے اور ہمارے قومی و تاریخی ہیرو اس کے ہیرو نہیں رہے ہیں[۱۶] ان کے خیال میں اس تفریق کا باعث تعلیمی نظام کا نقص ہے۔ وہ معاشرے کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ فرد، جدید تعلیم کے پروردہ، انگریزی ادبیات میں ایم اے، سی ایس پی، اعلی انتظامی عہدوں پر فائز رہنے والے ایک کامیاب شخص تھے۔ وہ ملک کی ایک بڑی جامعہ کے وائس چانسلر بھی رہے اس تمام تجربے کے بعد انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہماری تعلیم، طالب علم کے ذہن میں اترنے اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں ناکام رہی ہے[۱۷] ان کے تجزیے کے مطابق اس کا بڑا سبب نظام تعلیم کا ایک اجنبی زبان پر استوار ہونا۔ ہمارا ذریعہ تعلیم ۱۸۳۵ء سے انگریزی ہے۔ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوصف یہ نظام بڑی شخصیتیں پیدا نہیں کر سکا۔ انھوں نے ماضی قریب کی تاریخ سے مثالیں دے کر بتایا کہ دہلی کالج کے وہ طالب علم جو اردو میں تعلیم پاتے، سائنس میں انگریزی ذریعہ تعلیم والے طالب علموں سے بڑھے ہوئے تھے۔ رُڑکی انجینئرنگ کالج ہو یا آگرہ میڈیکل کالج جہاں بھی اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا ناکامی نہیں ہوئی۔ انجمن پنجاب اور جامعہ عثمانیہ کے تجربات اس کے امکانات کے روشن ہونے کا پتا دیتے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں، جس کا نظام مولانا محمد علی جوہر نے وضع کیا، ذریعہ تعلیم انگریزی نہیں تھا، یہاں بی اے کا نصاب ایف اے میں پڑھا دیا جاتا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں سر راس مسعود ذریعہ تعلیم کے مطالعے کے لیے جاپان گئے تو واپس آکر انھوں نے اعتماد کے ساتھ پوری توجہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے پر دی[۱۸] جالبی صاحب اس خیال کے حامی تھے کہ مسلم تعلیمی روایت میں عوام وخواص کی کوئی تخصیص نہیں رہی، مسلمانوں کے تصور میں تعلیم دینا اور پھیلانا ثواب اور آخرت سنوارنے کا ذریعہ تھا۔ مادی فوائد کا کوئی تصور نہیں تھا، اس کے برخلاف آج اسکول اپنی فیسوں سے پہچانے جاتے ہیں اور تعلیم کو اب صنعت کا درجہ

دے دیا گیا ہے[19] جالبی صاحب نے یہ خیالات ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی یادگاری خطبے میں ظاہر کیے تھے۔ یہ خطبہ ۲۸؍جنوری ۱۹۹۳ء کو کراچی میں دیا گیا۔ راقم کو انھوں نے اس کی مطبوعہ کاپی اپنے دستخطوں کے ساتھ ''عزیزی زاہد منیر عامر کے لیے، جمیل جالبی ۲۹؍۴؍۱۹۹۳ء'' لکھ کر عنایت فرمائی۔ اس کے بعد وطن عزیز میں تعلیم جس طرح مزید جنس بازار بنتی چلی گئی، وہ ان کے تجربے میں نہیں آیا۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن کے زیر اثر تحقیقی مقالات و مجلّات کی گرم بازاری، اساتذہ میں حصول منفعت کے لیے غیر صحت مندانہ مسابقت، تعلیمی اداروں میں پنپنے والی غلیظ سیاست، عہدوں اور اعزازات کی غیر معیاری جنگ نے صورت حال کو اس سے کہیں زیادہ ابتر کر دیا ہے جس کا مشاہدہ جالبی صاحب نے کیا تھا۔

جو شخص جتنا کام کرتا ہے اس پر اتنی ہی انگشت نمائی کے مواقع پیدا ہو جاتے ہیں۔ جالبی صاحب کے یادگار کاموں میں مغربی تنقید کے شاہ کار مضامین کا اردو ترجمہ ارسطو سے ایلیٹ تک بھی شامل ہے، جو خود ان کے بہ قول ان کی خشک سالی کے دنوں کی پیداوار ہے۔ جب انھیں اس خیال نے آ لیا تھا کہ اب ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا تو انھوں نے اس کرب ناک کیفیت کا مقابلہ اس طرح کیا کہ چلیں اگر میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے تو دیکھتے ہیں کہ دنیا کے دوسرے سوچنے اور لکھنے والوں کے پاس کیا ہے؟ چنانچہ انھوں نے مغرب کی ادبی فکر کو تسلسل کے ساتھ اردو میں منتقل کرنے کا کام کیا۔ لاہور کے زمانہ قیام میں انھوں نے ان تراجم کے ساتھ مصنفین کے حالات زندگی اور فکری کارناموں پر تعارفی نوٹ بھی لکھ ڈالے اور مغرب کی فکری تاریخ میں ان مضامین کی اہمیت بھی بتا ڈالی۔ راقم نے اپنے دور طالب علمی میں اس کتاب کا مطالعہ کیا اور مغربی تنقیدی فکر سے آشنائی کے لیے اسے ایک مفید کتاب پایا تاہم موازنے سے متن کے ساتھ ترجمے کی وفاداری کا حال کھلا۔ ارسطو کی *Poetics* کو دنیائے تنقید میں جو مقام حاصل ہے محتاج بیان نہیں۔ یورپ میں تو اسے ادبی تنقید کی پہلی کتاب مانا جاتا ہے بہ قول عزیز احمد ''نہ صرف یونان بلکہ یورپ بھر میں ارسطو کی یہ کتاب فنِ تنقید پر پہلی کتاب تھی جس میں شاعری کو ایک جداگانہ اور خود مختار فن سمجھ کے بحث کی گئی ہے''۔[20] بوطیقا کا عربی ترجمہ براہ راست یونانی سے نہیں ہوا بلکہ عربی ترجمہ جس کا مسودہ پیرس میں محفوظ ہے اور جو چودھویں صدی عیسوی کے وسط کا مکتوبہ ہے، ایک سریانی ترجمے کا ترجمہ ہے۔ اصل سریانی ترجمہ اب نابود ہو چکا ہے اور اس کے مترجم کا نام بھی کسی کو معلوم نہیں۔ پروفیسر مارگولیتھ نے عربی ترجمے کے کچھ حصوں کا لاطینی میں

ترجمہ کیا ہے جو ان کی *Analeca Orientalia* مطبوعہ ۱۸۸۷ء میں شامل ہے۔عزیز احمد نے بوطیقا کے متعدد تراجم کا تعارف کروایا ہے تاہم ان کی رائے میں بوطیقا کا پہلا مکمل ترجمہ ٹوائی ننگ (Twining) کا ہے جو لندن سے ۱۷۸۹ء میں شائع ہوا۔[۲۱] انھوں نے اپنا ترجمہ مختلف انگریزی ترجموں کی مدد سے تیار کیا ہے جہاں اختلاف تھا وہاں بچر (Butcher) کے ترجمے کو ترجیح دی ہے کیونکہ ان کی رائے میں یہ ترجمہ اس وقت تک کی جدید ترین تحقیقات کے بعد کا تھا اور ہر متنازعہ فیہ موقع پر عربی ترجمے سے استصواب کرتا ہے۔انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ''کتاب کے ابواب کی تقسیم کی حد تک اور بعض اصطلاحات کے ترجمے میں میں نے ٹوائی ننگ (Twining) کی پیروی کی ہے جس نے کتاب کو نفس مضمون کے اعتبار سے پانچ بڑے مفید حصوں میں تقسیم کیا ہے''[۲۲] عزیز احمد کا یہ ترجمہ بیسویں صدی کے نصف اول میں کیا گیا۔دیباچے کے اختتام پر ''جامعہ عثمانیہ ۲۲/جون ۱۹۴۱ء'' کی تاریخ درج ہے۔جالبی صاحب نے اسی صدی کے نصف آخر میں ازسرنو بوطیقا کا ترجمہ کیا۔انھوں نے ایک انٹرویو میں بوطیقا کے نئے ترجمے کا یہ جواز پیش کیا تھا کہ ''عزیز احمد کا ترجمہ مجھے پسند نہیں رہا''[۲۳] لیکن اس ناپسندیدگی کی کوئی ٹھوس وجہ انھوں نے بیان نہیں کی تھی جیسی مثال کے طور پر یہ کہ عزیز احمد نے بعض اصطلاحوں کو ہندی متبادلات دیے ہیں مثلاً کورس کے لیے ''سنگیت'' غنائی شاعری کو ''بھجن'' لائر کو ''چنگ'' وغیرہ جس سے مفہوم کے ابلاغ میں رکاوٹ پڑتی ہے[۲۴]

جالبی صاحب نے لکھا ہے کہ ۱۴۹۸ء میں جیورجیو ولا نے عربی سے اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا لیکن یونانی زبان کا اصل متن پہلی بار ۱۵۰۸ء میں شائع ہوا۔یورپ، یونانی تصانیف سے عربوں کے توسط ہی سے متعارف ہوا ورنہ تقریباً پونے دو ہزار سال تک یورپ یونانی تصانیف کی اہمیت سے لاعلم تھا۔بوطیقا کا پہلا تنقیدی ایڈیشن روبورٹیلی نے ۱۵۴۸ء میں مرتب و شائع کیا[۲۵] لیکن جالبی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ ترجمہ کرتے ہوئے انھوں نے کونسا متن اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ارسطو سے ایلیٹ تک ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی اس کے تیئس برس بعد مقتدرہ قومی زبان نے دنیا کی عظیم کتب کے تراجم کا ایک سیٹ شائع کیا تو اس میں بوطیقا بھی شامل تھی۔اس سلسلے میں جالبی صاحب کا یہ ترجمہ الگ کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔یہ وہی ترجمہ ہے جو ارسطو سے ایلیٹ تک میں تھا سوائے اس کے کہ دوسرے باب کے عنوان کو ''شاعرانہ نقل کی اشیا'' سے بدل کر ''شاعرانہ نقل کے عوامل'' کر دیا گیا ہے[۲۶]

دسویں باب کے عنوان میں ''سادے اور پیچیدہ پلاٹ'' کو ''سادہ اور پیچیدہ پلاٹ'' بنادیا گیا ہے [۲۷] یا پھر یہ کہ ارسطوسے ایلیٹ تک میں بوطیقا کا چھبیسواں باب بھی تھا جو اس اشاعت سے غائب ہے ۔اس اشاعت کے لیے جالبی صاحب نے بوطیقا کا ایک مفصل تعارف تحریر کیا۔ جون ۱۹۹۶ء میں لکھے گئے چودہ صفحات پر مشتمل اس تعارف میں انھوں نے بوطیقا کے موضوعات اور اہمیت پر بحث کی ہے متن کے مسائل پر نہیں ۔ یہ غنیمت ہے کہ اس تعارف کی آخری تین سطروں میں انھوں نے اپنے ترجمے کے مآخذ کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''بوطیقا کا یہ ترجمہ ٹی ایس ڈورش (TS Dorsch) کے اس جدید تر ترجمے سے کیا گیا ہے جسے ان گرام بائی واٹر (INGRAM BYWATER) کے آکسفورڈ کلاسیکل متن سے انگریزی میں کیا اور جو ۱۹۶۵ء میں پہلی بار شائع ہوا [۲۸]

کسی پرانے ترجمے کی موجودگی کے باوصف جب نیا ترجمہ کیا جاتا ہے تو امید کی جاتی ہے کہ نیا ترجمہ متقدم ترجمے سے بہتر اور زیادہ جامع ہوگا لیکن نظر بہ ظاہر ایسا نہیں ہے ۔ جالبی صاحب نے ہادی حسین کے تراجم پر یہ اعتراض کیا تھا کہ انھوں نے مضامین اور کتابوں کا خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔ [۲۹] یہ روش خود ان کے ہاں بھی دکھائی دیتی ہے۔ ایک تو انھوں نے اس کتاب میں عزیز احمد کے ترجمے کا ذکر نہیں کیا دوسرے ان کے ہاں مطالب کو مختصر کرنے کا رجحان غالب ہے۔ بعض ابواب کا ترجمہ چھوڑ دینے کا اظہار کیا گیا ہے لیکن متن کے بیچ میں در آنے والے پیچیدہ مطالب کے چھوٹ جانے کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ بوطیقا کے جن ابواب کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے وہ بیسویں اور اکیسویں باب ہیں کہ ان دو مختصر ابواب میں ارسطو نے خالص فنی بحثیں کی ہیں جن کا تعلق یونانی فن لغت اور گرامر سے ہے اس لیے فاضل مترجم کہتے ہیں کہ ''ان کا ترجمہ نہیں کیا گیا'' [۳۰] یہ صورت حال ارسطوسے ایلیٹ تک میں تھی ۔ جب یہ ترجمہ کتابی صورت میں شائع ہوا تو اس وقت تک شمس الرحمٰن فاروقی کا ترجمہ بھی سامنے آچکا تھا اور کسی کتاب کے جزو کی حیثیت سے شائع ہونے سے بڑھ کر الگ کتابی صورت میں شائع کیے جانے کے موقع پر توقع کی جاسکتی تھی کہ فاضل مترجم قاری کو پورے دستیاب متن سے روشناس کروائیں گے لیکن الگ کتابی اشاعت کی صورت میں یہ دونو ابواب ترجمے سے غائب ہی رہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے بوطیقا کا ترجمہ جالبی صاحب کے بعد کیا۔ انھوں نے مذکورہ دونو ابواب کا ترجمہ کیا ہے لیکن حاشیے میں ایک باب کے بارے میں ''سینٹسبری کا خیال پیش کیا ہے کہ یہ

شاید ارسطو کی تصنیف نہیں''[۳۱] کسی باب کو ترک کرنے کا یہ ایک معقول جواز ہوسکتا تھا لیکن فاروقی نے اس کے باوجود اسے ترک نہیں کیا جب کہ جالبی صاحب نے متن کا یہ حصہ ترک کیا اور ترک کا سبب بھی کچھ اور بتایا۔ جہاں تک باقی متن کا تعلق ہے تو ترجمہ شدہ ابواب کے بیچ بیچ میں بھی مطالب چھوٹ گئے ہیں جس کے باعث بوطیقا کا یہ ترجمہ ناتمام رہ گیا ہے۔ صرف یہی نہیں جالبی صاحب کو جو اعتراض ہادی حسین کے تراجم پر تھا بوطیقا کا ترجمہ ان کے ہاں بھی اسی رنگ کا پرتو پیش کرتا ہے۔ جالبی صاحب نے عزیز احمد بلکہ ٹوائی ننگ کی طرح کتاب کو پانچ حصوں میں تقسیم نہیں کیا، انھوں نے اس کے متن کو چھوٹے چھوٹے چھبیس ابواب کی صورت دی ہے، الگ کتابی صورت میں شائع کرتے ہوئے پچیس ابواب رہ گئے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا ترجمہ جالبی صاحب کے ترجمے کے پانچ برس بعد سامنے آیا۔ انھوں نے یہ ترجمہ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی کی فرمائش پر کیا۔ بورڈ کی فرمائش تھی کہ ایس۔ ایچ بچر (S.H. Butcher) کے متن کو بنیاد بنایا جائے، بچر کا اوّلین ایڈیشن ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا تھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے وضاحت کی ہے کہ بوطیقا کا موجودہ متن یونانی نسخے پر مشتمل ہے جو غالباً گیارھویں صدی میں قسطنطنیہ میں دریافت ہوا اور پندرھویں صدی میں پیرس پہنچ گیا جہاں وہ اب بھی محفوظ ہے۔ قدیم ترین غیر یونانی نسخہ ابوبصر کا کیا ہوا عربی ترجمہ ہے جو کسی سریانی ترجمے کا ترجمہ ہے.....عربی ترجمے سے لاطینی اور یونانی سے انگریزی میں پروفیسر مارگولیتھ نے منتقل کیا[۳۲]۔ فاروقی کہتے ہیں کہ انھوں نے حتی الامکان بچر کی عبارت کو ترجیح دی ہے لیکن چھ دوسرے تراجم کو بھی پیش نظر رکھا ہے جن کی تفصیل انھوں نے اپنے دیباچے میں بیان کردی ہے۔ اس دیباچے میں انھوں نے اپنے پیش رو عزیز احمد کے ترجمے کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے دیباچے کو مفصل اور دلچسپ قرار دیتے ہوئے بعض حواشی کے کارآمد ہونے کا اعتراف کیا ہے[۳۳] تاہم ان کے ہاں متن، عزیز احمد یا ٹوائننگ کی طرح پانچ حصوں میں نہیں بلکہ جالبی صاحب کی طرح چھوٹے چھوٹے چھبیس ابواب میں تقسیم کیا ہے اگرچہ انھوں نے جمیل جالبی کے ترجمے کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ اپنے دیباچے کے آخر میں یہ ضرور کہا ہے کہ ''امید ہے یہ ترجمہ ایک بڑی کمی کو کسی حد تک پورا کر سکے گا''[۳۴]

راقم اس سوال سے پریشان رہا ہے کہ اہل علم کا کردار الا ماشاللہ قومی توقعات کے مطابق کیوں

نہیں ہوتا۔اس خیال سے کہ شاید یہ مظہر صرف عہد حاضر سے خاص ہو ماضی میں بھی جھانکتا رہا ہے۔ایک بار جالبی صاحب لاہور آئے اوران سے کئی ملاقاتوں کا موقع ملاتواس حوالے سے کچھ اعتراضات و سوالات ان کے سامنے رکھے۔مثال کے طور پر میں نے ابن خلدون کا ذکر کیا جوایک عبقری ذہن کا مالک اور فلسفہ تاریخ کا بانی مفکر تھا لیکن قومی حوالے سے اس کا کردار کوئی زیادہ اچھی مثال پیش نہیں کرتا۔جب ابن خلدون کی یہ کیفیت رہی تو آج کل کے اربابِ دانش کا حال معلوم۔انھوں نے کامن سینس کی مدد سے میرے سوالات کے جواب دیے اور مزید تفصیل کے لیے مجھے اپنے استفسارات خط کی صورت میں لکھ کر بھیجنے کا کہا۔میں نے انھیں خط لکھا کہ آپ کے ساتھ ملاقات میں اہلِ علم کے کردار کی مناسبت سے ابنِ خلدون کا ذکر ہوا تھا کہ منگولوں کے حملے کے وقت اس سے جس اجتماعی شعور کی توقع تھی وہ اس کا مظاہرہ نہ کرسکا اور ذاتی مفاد کے لیے حملہ آور کی خوشامد کرنے لگا،آپ نے فرمایا تھا کہ ممکن ہے اس کی خوشامد میں اجتماعی مفاد کا کوئی پہلو ہو۔اس کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ اس کا اخلاقی و دینی تصور بہت محدود تھا اور اس میں اخلاص، وفا اور دوسروں کی خیر سگالی کے جذبات نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ اس کی وفاداریاں زمانے کی گردشوں کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی تھیں۔دمشق کی مہم میں اسے ساتھ لینے کا مقصد یہ تھا کہ وہ تیمور سے اپنے ہم وطنوں کے لیے سفارش کرے گا اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کو اجتماعی مفاد کے لیے بروئے کار لائے گا لیکن اس کی تیمور سے ملاقات کا جو حال معلوم ہوتا ہے وہ ہماری توقعات کے مطابق نہیں۔میں نے آپ سے ابن خلدون پر محمد عبداللہ عنان مصری کی کتاب کا ذکر کیا تھا جو ابن خلدون کے چھ صد سالہ جشن کے موقع پر ۱۹۳۲ء میں لکھی گئی۔اس نے اس موقع کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، میں اس کا ایک اقتباس نقل کرتا ہوں پھر آپ اس کے طرزِ عمل کے جواز یا عدم جواز کے بارے میں اپنی رائے دیجیے گا۔

He was afraid that the city would fall into the hands of the invader when he would be killed or tortured. He resorted to audacity and decided to abandon the hesitant commandars and go to the invaders camp to ask him to spare his life and ensure his fortune ۳۵

اس نے خود التعریف میں جو لکھا ہے اس کا ترجمہ:

I entered the tent where he was sitting, inclining

on his elbow, while the dishes were being carried before him to excite the appetite of the Mongol troops sitting in circles before his tent. When I entered I bowed and made signs of submission. He raised his head and extended his hand which I kissed. ۳۶

جالبی صاحب کی خدمت میں یہ خط ۲۰۰۴ء میں ارسال کیا گیا۔ اپریل ۲۰۰۶ء میں ان سے پھر ملاقات کا موقع ملا تو میں نے انھیں اپنا استفسار اور اس حوالے سے لکھا جانے والا خط یاد دلائے ۔انھوں نے فرمایا کہ آپ اپنا وہ سوال دوبارہ بھیج دیجیے۔ دوبارہ یہی سوال ان کی خدمت میں بھیجا گیا لیکن ان کی جانب سے اس کا کوئی جواب نہیں ملا۔ ابن خلدون کے کردار میں ذاتی مفاد کو اجتماعی مفاد پر ترجیح دینے کا جو رجحان تھا اس کا اظہار اس کے معاصرین اور تذکرہ نگاروں نے کھل کر کیا ہے۔ انسانی کردار کا یہ پہلو بلاشبہ منفی ہے لیکن سرمایہ دارانہ نظام کے قائلین آج بھی اس کے حق میں دلائل پیش کریں گے، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ سلطان مغرب کی جانشینی کے قضیے میں مخالف گروہ نے ابن خلدون کے کپڑے تک اتروالیے تھے اور وہ بلالباس ہی بھاگنے پر مجبور ہوا تھا۔ دو روز کی برہنگی کے بعد اسے لباس میسر ہوا تھا گویا اس مرحلے پر اس کا علم و فضل اس کے کچھ کام نہیں آیا۔

جالبی صاحب کے کاموں میں ایک اہم کارنامہ مثنوی نظامی دکنی المعروف به کدم راو پدم راو کی تدوین بھی شامل ہے۔ یہ ان کا تیسرا تدوینی کام تھا، اس سے پہلے وہ دیوان حسن شوقی اور دیوان نصرتی بھی مرتب کر چکے تھے۔ یہ دونو متون تاریخ ادب اردو کی گم شدہ کڑیوں کی حیثیت رکھتے تھے ۔مثنوی نظامی کا متن ایک ہزار بتیس اشعار پر مشتمل ہے یہ مثنوی ۸۲۵ھ/ ۲۴۲۱ء اور ۸۳۹ھ/ ۱۴۳۵ء کے درمیان لکھی گئی، مصنف کا نام فخر دین اور تخلص نظامی ہے۔ اس تاریخی متن کی دریافت کا سہرا بابائے اردو مولوی عبدالحق کے سر ہے۔ اس خطی نسخے کے بارے میں مولوی صاحب کے ۴/ مارچ ۱۹۶۱ء کے مکتوبہ ایک غیر مطبوعہ خط میں یہ عبارت ملتی ہے:

''شاعر کا نام فخر الدین (کذا، فخر دین) اور تخلص نظامی ہے۔ اس کا ذکر نہ کسی تذکرے میں ہے نہ کسی اور کتاب میں۔ یہ نام اور تخلص بھی اس کی مثنوی ہی سے معلوم ہوا۔ سلطان علاء الدین بہمنی کے زمانے میں تھا جس کی مدح اُس نے اس مثنوی میں کی ہے۔ سلطان علاء الدین بن احمد شاہ ۸۳۸ء میں تخت نشین ہوا اور ۸۶۳ء میں وفات پا گیا۔'' ۳۷ مولوی صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ اس متن کو مرتب

کیا جائے انھوں نے اس مقصد کے لیے قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، سید ہاشمی فرید آبادی اور نصیر الدین ہاشمی جیسے علما سے اس متن کی تدوین کی امیدیں وابستہ کی تھیں جو کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکیں۔ نصیر الدین ہاشمی کو تو خاص اس متن کی تدوین کے لیے پاکستان آنے اور یہاں کی شہریت دینے کی پیش کش بھی کی گئی لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی۔ جالبی صاحب اس متن سے ۱۹۶۷ء میں متعارف ہوئے۔ ڈیڑھ برس کی کوششوں کے بعد اس متن کو پڑھا جاسکا اور تدوین متن میں پانچ برس سے زیادہ کا عرصہ لگا۔ مثنوی کی اشاعت یوں کی گئی ہے کہ دائیں جانب مخطوطے کا عکس اور بائیں جانب اس کی خواندگی دی گئی ہے۔ آخر میں فرہنگ، سلاطین بہمنی کا تعارف اور مثنوی میں مذکور شخصیات پر تعارفی نوٹ دیے گئے ہیں، جن سے کتاب کی معنویت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ یہ بات باعث تعجب ہے کہ شخصیات اور مآخذ کی فہرست میں الفبائی یا زمانی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اس مخطوطے کو پڑھ لینے کی منزل سر کر کے انھیں وہی خوشی حاصل ہوئی جو سر ایڈمنڈ ہلاری کو دنیا کی سب سے بڑی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے سے ہوئی تھی اور درحقیقت یہی کسی فن کار کی محنت کا سب سے بڑا ثمر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب مرحوم نے اس کتاب پر اپنے تبصرے میں ایک سے زائد مقامات پر یہ مشورہ دیا ہے کہ کسی لیبارٹری میں آسانی کے ساتھ کاغذ اور روشنائی کا زمانہ قطعی طور پر متعین ہوسکتا تھا۔ اگر برٹش میوزیم کی لیبارٹری سے استفادہ کرلیا جاتا تو یہ مسئلہ حل ہوجاتا ۔[۳۸] یہ مشورہ تو کسی بھی مدوّنِ متن کو دیا جاسکتا ہے، خود ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو بھی، جنھوں نے پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں محفوظ خطی نسخے[۳۹] کی مدد سے دیوان جہاندار مرتب کیا۔ یہ خطی نسخہ بہ ظاہر معاصر معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا صحیح زمانہ معلوم نہیں۔ پہلے صفحے پر مہر ہے جو کتاب کے کسی سابقہ مالک نے خراب کر کے اوپر کاغذ کی چپپی لگادی ہے، چپپی اتارنے پر بھی نقوش خوانا نہیں۔ اس کے متصل ۱۲/ماہ ربیع الاول ۱۸۲۳ء درج ہے جو نسخے کے کاتب کی تحریر سے الگ ہے۔[۴۰] اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ خطی نسخہ درحقیقت کب لکھا گیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اگر برٹش میوزیم کی لیبارٹری سے استفادہ کرلیا جاتا تو یہ مسئلہ حل ہوسکتا تھا لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ کیا ہمارے زمینی حقائق عملاً اس کی اجازت دیتے ہیں؟ خاص طور سے جب کہ مثنوی نظامی دکنی کے ناشر جمیل الدین عالی صاحب کے بہ قول، جنھوں نے اس مخطوطے کی تدوین کو تاریخ ادب اردو کا ایک لازوال کام قرار دیا ہے، اس کتاب کی تدوین کے ''سلسلے میں انجمن نے ڈاکٹر جمیل جالبی کو کوئی مالی امداد بہم نہیں پہنچائی، انھیں ریسرچ اسسٹنٹ نہیں دیے، سفری

الاؤنس نہیں دیا، کسی قسم کا اعزاز یہ کوئی اورامداد یہ کچھ پیش نہیں کیا جا سکا نہ انجمن اب انھیں کوئی انعام دینے کی سکت رکھتی ہے......انھوں نے بابائے اردو کی ایک بہت ہی دشوار اوراہم وصیت پوری کر دی ہے''۔[41]

اس متن کی تدوین واشاعت بلاشبہ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی ایک بڑی خواہش تھی ۔وہ اس متن کی تدوین واشاعت کے لیے کوشاں رہےاوراس کے سلسلے میں اہل علم ،اپنے مداحوں ،اردو دوستوں ، محققین اساتذہ اورطالب علموں کو متوجہ کرتے رہےاس لیے کہ یہ متن اردو کی ادبی تاریخ کی عمر میں دوسو برس کا اضافہ کردینے کا باعث ہے۔جالبی صاحب نے یہ کام کر کے جہاں دنیا کو اردو زبان کی پہلی تصنیف سے آشنا کیا اوراردوادب کی تاریخ میں دوسو برس کا اضافہ کیا وہاں انھوں نے بابائے اردو کی خواہش بھی پوری کردی ۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس متن کے دریافت کنندہ کی حیثیت سے بابائے اردو کے نام کتاب کا انتساب کرتے ہوئے''حق بحق داررسید'' کے کلمات سے بجا طور پران کا اعتراف کیا ہے۔ہماری قومی تاریخ کے افسوس ناک المیوں میں انجمن ترقی اردو کا وہ المیہ بھی شامل ہے جسے بابائے اردو کے قلم نے زبان دی ہے ۔راقم نے ایک بار جالبی صاحب سے پوچھا کہ بابائے اردو کی غیر معمولی خدمات کے باوصف بعض لوگ انھیں ''بائے بائے اردو'' کہتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے......؟اس پر جالبی صاحب کا جواب تھا؛اس لیے کہ انھوں نے اردو کو نقصان پہنچایا۔میں یہ سن کر بھونچکا ہی تو رہ گیا۔وہ کیسے......؟ میں نے پوچھا۔''زبان کے مسئلے کو Politicise کرکے'' جالبی صاحب نے جواب دیا۔

جالبی صاحب کے کاموں میں نصرتی (م:۱۰۸۵ھ) کے دیوان کی ترتیب وتدوین بھی شامل ہے۔اردودنیا کو نصرتی سے مولوی عبدالحق نے متعارف کروایا۔انھوں نے ملک الشعرائے بیجاپور کی حیثیت سے اس پر پوری ایک کتاب لکھی۔[42] جالبی صاحب کو پہلی بار نصرتی کا دیوان مرتب کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔وہ جب تاریخ ادب اردو پرتن تنہا کام کرتے ہوئے سیکڑوں بیاضوں اورمخطوطات کے جنگل سے گزرے تو انھیں ملا نصرتی کا کلام ملتا رہا، جسے وہ جمع کرتے رہے ۔اس دیوان میں نصرتی کی مثنوی، قصائد،مخمسات،ہجو،غزلیات،قطعات اوررباعیات شامل ہیں ۔اگر چہ مدوّن کی یہ ذمے داری نہیں کہ وہ زیرتدوین شاعری کی تنقید کا فریضہ بھی انجام دے ۔بعض حضرات کی رائے میں تو ایسا کرنا نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں بلکہ''اخلاقی جرم''[43] بھی ہے لیکن جالبی صاحب نے اپنی تنقیدی بصیرت کو کام میں لاکر یہ ذمہ داری بھی اپنے سر لی ہے۔انھوں نے نصرتی اورحسن شوقی کے متون مرتب کرتے ہوئے مفصل

مقدمے تحریر کیے ہیں(دیوان نصرتی کا مقدمہ سولہ صفحات اور دیوان حسن شوقی کا مقدمہ ۶۸ صفحات پر مشتمل ہے)ان مقدموں سے اردو شعر کی تاریخ کے بعض نئے پہلو سامنے آئے ہیں۔کہا جاتا تھا کہ ولی اردو شاعری کا باوا آدم ہے، جالبی صاحب نے حسن شوقی کا کلام متعارف کروایا تو ان کے مقدمے سے معلوم ہوا کہ ولی کی غزل جس فراز پر کھڑی ہے،اس کی اساس حسن شوقی کے ہاں ملتی ہے جس کی غزلیں اس روایت کا ایک حصہ ہیں [۴۴] اس امر کا اعتراف خود ولی نے بھی کیا ہے جو کہتا ہے ۔

برجا ہے اگر جگ میں ولی پھر کے دجے بار
رکھ شوق مرے شعر کا شوقی حسن آوے

[۴۵]

میر کا یہ کہنا کہ ''معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا'' یا قائم کا ریختہ کو غزل آشنا کرتے ہوئے ماضی میں اسے ''اک بات لچرسی بہ زبان دکنی تھی'' قرار دینا روایت کے تخلیقی سوتوں کی نشان دہی کرتا ہے، وہ روایت جس پر بہ قول ڈاکٹر جمیل جالبی ''حسن شوقی ایک ایسے درمیانی پل کی حیثیت رکھتا ہے جس پر سے گزرے بغیر ولی کی روایت تک نہیں پہنچا جا سکتا'' [۴۶] جالبی صاحب نے صرف یہی نہیں کہ مستقبل کی غزل پر حسن شوقی کے اثرات سے ہمیں آگاہ کیا ہے انھوں نے خود حسن شوقی کی غزل پر جن شعرا کے اثرات ہیں ان سے بھی ہمیں متعارف کروایا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ شوقی کی غزل میں مشتاق، لطفی، محمود، فیروز اور خیالی کے اثرات ایک نئے روپ میں ڈھلتے ہیں اور پھر یہ نیا روپ شاہی، نصرتی، ہاشمی، اشرف، سالک، یوسف، تائب، قریشی اور ایسے بہت سے دوسرے نامعلوم وگم نام شعرا کے ہاں سے ہوتا ولی کی غزل میں رنگ جماتا ہے'' [۴۷] ولی کا تعلق گیارھویں صدی ہجری سے تھا حسن شوقی دسویں صدی ہجری کا شاعر ہے اس طرح جالبی صاحب نے اپنی اس تحقیق کے ذریعے اردو غزل کی عمر میں اضافہ کیا۔

دیوان نصرتی کے مقدمے میں انھوں نے نصرتی کے کلام پر تفصیل سے تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور اس کے تصورِ عشق کو سطحی قرار دیا ہے اور اس کے ہاں جسمانی لذت کی ہوس کے عناصر تلاش کیے ہیں .....ان کے نزدیک '' نصرتی کی غزلوں میں جسم کو چھونے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی حسرت ہے ،اس کی غزلوں میں ندیدے پن اور عورت کو دیکھ کر رال ٹپکنے کا احساس ہوتا ہے.....'' [۴۸] بجا لیکن آخر میں انھوں نے ایک ایسی فارسی غزل بھی نصرتی سے منسوب کی ہے جس کا فنی معیار اور فکری رجحان نصرتی سے

مناسبت نہیں رکھتا، غزل یہ ہے:

از پنجۂ من چاکِ گریبان گلہ دارد — وز گریہء من گوشہء دامان گلہ دارد
ازبسکہ بہ زندانِ غمت دیر بماندم — زنجیر بہ تنگ آمدہ، زندان گلہ دارد
دامانِ نگہ تنگ، گل حسنِ تو بسیار — گلچینِ بہار تو زدامان گلہ دارد
گہ بت شکنم ،گاہ بمسجد زنم آتش — کز مذہبِ من گبر و مسلمان گلہ دارد
دربزمِ وصالِ تو بہ ہنگامِ تماشا — نظارہ زجنبیدنِ مژگان گلہ دارد
سنبل بہ چمن مشک فشان نافہ ء تاتار — از غربتِ من زلفِ پریشان گلہ دارد

گہ گریم و گہ خندم وگہ آہِ جگر سوز
ای نصرتی از وضعِ تو جانان گلہ دارد [۴۹]

جالبی صاحب نے حاشیے میں روز روشن اور فرہنگ سخنوران وغیرہ کے حوالوں سے اس غزل کی مختلف نسبتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس غزل کا تیسرا اور پانچواں شعر غالب نے قدسی (مشہدی) سے منسوب کیا ہے، موجودہ تحقیق کی روشنی میں یہ صحیح نہیں ہے'' جالبی صاحب نے جدید تحقیق کے دلائل پیش کیے ہیں نہ یہ بتایا ہے کہ غالب نے کہاں پر ان اشعار کو قدسی سے منسوب کیا ہے؟ جدید تحقیق سے ان کی مراد غالبًا ان کی اپنی تحقیق ہے لیکن ان کی اپنی تحقیق وتنقید، نصرتی کی شاعری کے جس رنگ ڈھنگ کو دریافت کرتی ہے وہ اس غزل سے لگا نہیں کھاتا۔ اس غزل کو اگر کسی رنگ خاص سے مشابہ قرار دیا جاسکتا ہے تو وہ سبک ہندی کے اساتذہ کا رنگ ہے۔

راقم نے ایک بار سید نفیس الحسینی صاحب سے دریافت کیا تھا کہ شعر (دامان نگہ تنگ ......الخ) کس کا ہے؟ نفیس شاہ صاحب مرحوم کلاسیکی ادب کا نہایت عمدہ ذوق اور مطالعہ رکھتے تھے۔ انھوں نے بے ساختہ قدسی مشہدی کا نام لیا تھا۔ قدسی کا پورا نام حاجی محمد جان قدسی ہے۔ ان کا تعلق جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مشہد سے تھا۔ تذکرہ نگار انھیں ''سرحلقہء ناظمان جواہر فصاحت وسرآمد جوہریان بازار بلاغت'' قرار دیتے ہیں۔ ۱۰۴۱ھ میں لاہور آئے [۵۰] شاہ جہاں نے انھیں ملک الشعرائی کا خطاب دیا، اپنے تخت پر بٹھایا اور روایت کے مطابق سونے میں تلوا کر سارا سونا ان کی نذر کر دیا......قدسی کا ایک بیٹا جوان مرگ ہو جانے پر وہ دل شکستہ ہو گئے اور وطن واپسی کا خیال ترک کر دیا۔ لاہور ہی میں ''۱۰۵۶ھ

میں عالم قدس کو روانہ ہوئے'' [۵۱] یہیں سپرد خاک ہوئے لیکن بعدازاں انھیں مشہد منتقل کر دیا گیا۔ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ کشمیر چلے گئے تھے اور وہیں مقبرہ شعرا میں مدفون ہیں۔محولہ بالا شعر کے حوالے سے بعدازاں خطوط غالب دیکھے تو ان سے کچھ مزید معلومات حاصل ہوئیں۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خوانندگان کرام کو بھی ان میں شریک کیا جائے۔غالب نے اپنے ایک خط بنام نواب امین الدین احمد خان میں لکھا ہے:

''مغربی،عرفا میں سے ہے بیشتر اس کے کلام میں مضامین حقیقت آ گیں ہیں لیکن 'دامان گلہ دارد' 'گریبان گلہ دارد' اس زمین میں میں نے اس کی غزل نہیں دیکھی۔حاجی محمد جان قدسی کی غزل اس زمین میں ہے ؎

در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشا
نظارہ زجنبیدن مژگان گلہ دارد [۵۲]

ایک اور خط میں یہی شعر نقل کر کے لکھا ہے''یہ زمین قدسی رحمۃ اللہ علیہ کے حصے میں آ گئی ہے ،میں اس میں کیوں کر تخم ریزی کروں گا اور اگر بے حیائی سے کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤں تو اس شعر کا جواب کہاں سے لاؤں'' [۵۳] نواب امین الدین خان نے غالب سے استفسار کیا ہوگا کہ یہ غزل مغربی کی ہے یا کسی اور کی؟ جس پر غالب نے یہ جواب لکھا۔مغربی (م:۸۸۹ھ/۱۴۸۴ء) تبریز کے صوفی شاعر تھے جن کا پورا نام محمد شیرین تھا۔اپنے وطن سے شام گئے اور شیخ ابن عربی سے بیعت کر کے عرفا میں شامل ہو گئے۔گویا اس غزل کا انتساب مغربی سے بھی کیا جاتا رہا ہے۔ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب نے اسے حیرتی تونی کی قرار دیا ہے [۵۴] بعض مصادر میں اس غزل کو عشرتی سے منسوب کیا گیا ہے۔

اس غزل میں معیار کی جو دورنگی پائی جاتی ہے وہ غالب کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔اس جانب توجہ کرتے ہوئے غالب نے لکھا ہے کہ''مغربی،قدما میں اور عرفا میں ہے جیسا عراقی۔ان کا کلام دقائق و حقائق تصوف سے لبریز۔قدسی،شاہجہانی شعرا میں صائب وکلیم کا ہم عصر اور ہم چشم۔ان کا کلام شورانگیز۔ان بزرگوں کی روش میں زمین آسمان کا فرق'' [۵۵] غالب کی غزل ..... پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے.....الخ میں کسی دوسرے شاعر کے اشعار شامل ہو گئے تھے۔غالب نے اس کا حوالہ دے کر لکھا؛

''اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مطلع اور
اُس بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کر کے ،غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ
گاتے پھرتے ہیں۔مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اُلو کے۔جب شاعر
کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ شاعر
متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو۔مقطع بے شک مولانا مغربی کا ہے
اور وہ شعر جو میں نے تم کو لکھا ہے اور یہ شعر جواب لکھتا ہوں ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار گلچینِ بہارِ تو ز دامان گلہ دارد

یہ دونو شعر قدسی کے ہیں.....'' [۵۶]

ماخذ مذکورہ میں مصرعہ اولیٰ کے درمیان واو کا اضافہ ہے۔یہ امر دلچسپ ہے کہ قدسی کا دیوان ایران سے شائع ہو چکا ہے۔راقم نے اس سے رجوع کیا تو بہرۂ غزلیات میں اس غزل کو موجود نہیں پایا۔ [۵۷]

جالبی صاحب کی تاریخ فرد واحد کا کیا ہوا ایک ایسا کام ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں جس کی کوئی دوسری نظیر پیش نہیں کی جا سکتی۔اس کام کو مختلف زاویوں سے دیکھا گیا ہے۔ایک زاویہ وہ ہے جس کا اظہار اس کتاب پر رشید حسن خان کے مضمون سے ہوتا ہے جن کا کہنا یہ ہے کہ جالبی صاحب نے اس کتاب کی تصنیف کے دوران میں اہم،کم اہم اور غیر اہم ماخذ میں امتیاز نہیں کیا ہے۔جس کے باعث اس کتاب میں کمیاں رہ گئی ہیں۔ [۵۸]

دوسرا زاویہ نظر وہ ہے جس کا اظہار اس کتاب پر مشفق خواجہ کے مضمون سے ہوتا ہے۔مشفق خواجہ مرحوم تنقید میں خاصے بے باک واقع ہوئے ہیں لیکن انھوں نے تاریخ ادب اردو کی خاصی مدح سرائی کی ہے اور اسے اردو ادب کی پہلی تاریخ قرار دیا ہے [۵۹] ایک بار راقم نے جالبی صاحب سے کہا کہ آپ نے تاریخ ادب اردو کی دوسری جلد میں میر سوز کے تلمیذ سودا ہونے کی رائے سے اتفاق کیا ہے اور اس کی دلیل میں میر سوز ہی کا ایک شعر پیش کیا ہے۔ [۶۰] راقم کا خیال ہے کہ سوز کسی کے شاگرد نہیں تھے جیسا کہ مولانا حسرت موہانی کے بنائے ہوئے شاعروں کے سلسلۂ تلمذ کے شجروں سے ظاہر ہے جنھوں نے سوز کو کسی سلسلۂ سخن میں محسوب کرنے کی بجائے اس کا اپنا سلسلۂ سخن قائم کیا ہے [۶۱] یہ ایک خارجی شہادت ہے۔اگر داخلی شہادت کی ضرورت ہو تو وہ بھی موجود ہیں اور ایک سے زیادہ۔سوز کے متعدد اشعار سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ شعر میں وہ کسی کے تلمیذ نہیں تھے ؎

یوں تو ہوں خوشہ چین سبھوں کا پہ سچ کہوں
یہ سوزِ دل ازل سے جو استاد ہے سو ہے

کون ایسا سوختہ ہے جس کو کہیے میر سوز
کون ہے ایسا کہ اپنا آپ ہی استاد ہو

سودا سے مشورۂ سخن کے سلسلے میں جالبی صاحب کی واحد دلیل سوز کا ایک شعر ہے ؎

ورنہ اس منہ پہ شاعری توبہ
یہ بھی مرزا رفیع کی ہے دولت

راقم کا کہنا تھا کہ شعر کا یہ متن محکم نہیں کیونکہ راقم کے پاس موجود ایک دوسرا اور کامل تر متن مصرعہ ثانی کی زیادہ بہتر شکل پیش کر رہا ہے جس میں رفیع کی ''ع'' گرنے کا عیب بھی نہیں ہے.....

ورنہ اس منہ پہ شاعری توبہ
یہ بھی سب صاحبوں کی ہے دولت [۶۲]

سوز اور سودا میں باہمی تعلق کے جو شواہد ملتے ہیں وہ تلمذ پر نہیں دوستی پر دلالت کرتے ہیں۔ سودا نے ایک سے زیادہ مقامات پر شعر میں سوز کی بڑائی کا اعتراف کیا ہے۔ جالبی صاحب نے میری معروضات کو غور سے سنا اور ان کے جواب میں فرمایا کہ میں دیکھ کر جواب دوں گا لیکن اس کی کبھی نوبت نہیں آسکی۔

جالبی صاحب سے ملاقاتوں کی آخری یادیں راقم کے مصر جانے سے پہلے کی ہیں۔ جالبی صاحب جہاں بھی ہوتے صدر ہر جا کہ نشید صدر است کے مصداق، صدرِ محفل دکھائی دیتے تھے۔ وطنِ عزیز کے صدر مملکت، اقبالیات پر لکھی جانے والی بہترین کتابوں پر سالانہ اوارڈ دیا کرتے ہیں۔ اقبال اکیڈمی کی اس کمیٹی میں جالبی صاحب اور دوسرے معزز منصفین کے ساتھ یہ خاکسار راقم سطور بھی شامل تھا۔ منصفین کے جس اجلاس میں جالبی صاحب آتے وہی اجلاس کی صدارت کیا کرتے اور ان کے وجود سے کرسی صدارت سج جایا کرتی تھی۔ ان کے انداز تکلم وصدارت میں سیکھنے کا بہت سا سامان ہوتا تھا اور یوں لگتا تھا کہ اس کرسی پر ان کے علاوہ کسی اور کا بیٹھنا زیبا نہیں۔ اس کے علاوہ ایک بار یوں

ہوا کہ لاہور یونی ورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز کے بورڈ آف گورنرز نے لمز میں اردو کی تدریس کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے راقم سے رابطہ کیا۔ ابتدائی ملاقاتوں کے بعد رسمی گفت وشنید کے لیے کراچی سے جالبی صاحب اور اسلام آباد سے فتح محمد ملک صاحب کو بلا کر ہر دو اصحاب سے چائے پر ملوایا گیا۔ مدعا یہ تھا کہ ممکنہ تقرر کے لیے ان حضرات کی رائے لی جائے۔ دونو بزرگوں نے راقم کے حق میں کلمہ خیر کہا لیکن انھی دنوں حکومت پاکستان کی جانب سے میرا تقرر جامعہ الازہر قاہرہ میں مسند اردو و مطالعہ پاکستان پر ہو گیا۔ اب دونو ہی صورتیں مثبت اور اردو کے حوالے سے مفید تھیں۔ میں نے جالبی صاحب کو صورت حال سے آگاہ کر دیا اور ان سے مشورے کا خواہاں ہوا۔ جالبی صاحب نے کہا کہ لمز میں اردو کی تدریس کا آغاز کرنا ایک بڑی خدمت اور اعزاز ہے لیکن قاہرہ جا کر آپ اس سے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر ملک و قوم کی خدمت انجام دے سکیں گے یوں انھوں نے قاہرہ کے حق میں مشورہ دیا۔ رفتہ رفتہ راقم کا رجحان بھی قاہرہ کی جانب ہو گیا۔ یوں لمز سے معذرت کرنا پڑی اور میں قاہرہ روانہ ہو گیا۔ اتفاق سے اس ملاقات کی یاد بھی ایک تصویر کی صورت میں موجود ہے۔ اس کے بعد اگرچہ جالبی صاحب طویل عرصہ تک حیات رہے لیکن کراچی اور لاہور کا فاصلہ ملاقات کی راہ میں حایل رہا۔ یہاں تک کہ ہمارے اور ان کے درمیان وہ فاصلہ آ پڑا جس کے بعد ملاقات اس روز ہو گی جس روز کے ہول سے سر سفید ہو چکے ہوں گے اور جب ''نہ مجھ کو تاب سوال ہو گی نہ اس کو اذنِ جواب ہو گا''..... جالبی صاحب بلا کے محنتی تھے۔ صبح فجر کے وقت بیدار ہوتے، ٹہلتے، نماز فجر ادا کرتے (اور وہ یہی ایک نماز ادا کرتے تھے) نو بجے تک گھر پر کام کرتے۔ اس کے بعد دفتر جاتے۔ دفتر میں ادب اور ادبی دنیا میں دفتر کو داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ دوپہر کا قیلولہ اور شام کو بیدار ہو کر غسل، چائے اور واک ان کے معمولات میں شامل رہے۔ رات کو وہ ڈیڑھ دو بجے تک جاگتے۔ گویا ان کی رات کی نیند چار گھنٹے سے زائد نہیں رہی۔ جب انسان صبح فجر سے نو بجے تک کام کر کے دفتر آتا ہے تو اس کے شانوں پر دن بھر کوئی بوجھ نہیں رہتا۔ وہ ویسی ہی خوش مزاجی کا مظاہرہ کر سکتا ہے جیسا کہ جالبی صاحب اپنے ملاقاتیوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ان کا آغاز اسکول کی مدرّسی سے ہوا تھا لیکن وہ اپنی محنت سے بڑے بڑے مناصب تک پہنچے اور انھوں نے ایک خوش حال زندگی گزاری۔ ایسی زندگیاں عام طور سے عیش و عشرت کے بعض ناپسندیدہ عناصر سے آلودہ ہو جایا کرتی ہیں لیکن جالبی صاحب کسی آلائش کا شکار نہیں ہوئے۔ کوئی نشہ کجا وہ سگریٹ تک نہیں پیتے تھے۔ پان کھانا

ان کا ایک شوق تھا جس سے ان کی شخصیت کے وقار میں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ خاص طریقے سے پکایا ہوا کتھا، دہی ملایا ہوا چونا، تلاش کر کے حاصل کی گئی پرانی چھالیا، الائچی، زردہ اور قوام ان کے پان کی خصوصیات تھیں۔ نفاست اور دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ بازار سے پان خریدنے کی بجائے انھوں نے پان کی بیل بھی اپنے گھر ہی میں لگائی تھی۔ گو آخر کار ڈاکٹروں نے ان سے یہ سب کچھ چھین لیا لیکن عمر بھر ان کا پان سے ناتا رہا۔ سعودی عرب کے زمانہ قیام میں جب انھیں پان نہ ملے تو انھوں نے سگریٹ پینے کی کوشش کی مگر انھیں اس میں کامیابی نہ ہوئی۔

وہ ایک تہذیب کے نمائندہ تھے اور ان کی آنکھوں میں بہ قول جوش ملیح آبادی ''ذہانت کی چمک اور لہجے میں شرافت کی کمک پائی جاتی'' [۶۳] تھی۔ انھوں نے ایک کامیاب زندگی گزاری۔ عمر بھر جو جی چاہا وہ کیا اور جیسے جی چاہا کیا۔ ان کے لیے سوچنا، پڑھنا اور لکھنا زندگی کی سب سے بڑی سرگرمی رہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا اسی کیف اور فکر و احساس کے ساتھ لکھا جس سے ''ایک ناول نگار ناول لکھتا ہے یا شاعر شعر کہتا ہے یا مصور تصویر بناتا ہے یا مفکر اظہار خیال کرتا ہے'' انھیں یقین تھا کہ '' کام تو خود خوشبو ہے جو نہ صرف باقی رہتی ہے بلکہ جب آتی ہے تو سارے وجود کو تازہ دم کر جاتی ہے'' [۶۴] وہ اسی خوشبو پر یقین رکھنے والے مصنف تھے۔ وہ ہمارے درمیان سے رخصت ہو گئے لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کے کاموں کی خوشبو سے مستقبل کا ادبی منظر نامہ بھی مہکتا رہے گا۔ نظیری

از خردہ ای کہ دارد گل در قبا نگنجد
ہر جا کہ ہست ذوقی می گردد آشکارا

☆☆☆

﴿1﴾
صدر نشین

ڈاکٹر جمیل جالبی

تاریخ: ۵/اگست ۱۹۸۹ء

ذ.....۱۲۴۰

محترمی زاہد منیر عامر صاحب، السلام علیکم

آپ کی دو کتابیں.....لمحوں کا قرض [۶۵] اور اپنی دنیا آپ پیدا کر [۶۶] کا ایک ایک نسخہ موصول ہوا جن کے لیے شکر گزار ہوں۔ ان دونوں کتابوں سے اندازہ ہوا کہ آپ ایک سوچنے والے ذہن کے مالک ہیں اور فلسفہ اور فکر کو عہد حاضر کے حوالے سے ادب کا حصہ بنانے میں مصروف ہیں۔ یہ ایک قابل تعریف رجحان ہے۔ ان کتابوں کی اشاعت پر میری طرف سے دلی مبارک باد قبول کیجیے۔

بخدمت گرامی: آپ کا مخلص

جناب زاہد منیر عامر صاحب (دستخط) جمیل جالبی

دانشکدہ ۹۲۔ اسلام پورہ سرگودھا۔ (ڈاکٹر جمیل جالبی)

﴿2﴾

صدر نشین

ڈاکٹر جمیل جالبی

تاریخ: ۲۲/اکتوبر ۱۹۹۱ء ذ۔۱۶۸۲

عزیزم! السلام علیکم

آپ کا خط مورخہ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۱ء ملا۔ حسبِ وعدہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں میں نے میر سوز والی بیاض/مخطوطہ دیکھا۔ [۶۷] مخطوطے کا نمبر یہ ہے SUI VII/۳۶۹۹ نمبر ۶۷۷۔ یہ بیاض متوسط تقطیع پر لکھی ہوئی ہے۔ کاغذ موٹا، قلم جلی، خط معمولی اور بیاض کرم خوردہ ہے۔ اس کے ابتدائی دو صفحے یعنی ایک ورق موجود نہیں ہے۔ شروع میں دیوان نیاز (اردو) صفحہ ۳ سے صفحہ ۳۶ تک لکھا ہوا ہے اور اس پر نوشتہ ۱۲۷۳ ہجری درج ہے۔ صفحوں کے نمبر بائیں جانب سے شروع کیے گئے ہیں۔ ہر شاعر کے کلام کے بعد نیا صفحہ نمبر شروع ہوتا ہے۔ صفحہ ۱ سے ۷۹ تک دیوان نیاز فارسی لکھا گیا ہے۔ صفحہ ۷۹ پر ایک شعر اردو کا

درج ہے۔صفحہ ۸۰ تمام اردو ہے۔صفحہ ۸۱ خالی ہے اور صفحہ ۸۲ پر پھر اردو اشعار دیے گئے ہیں۔دیوان مرزا سودا صفحہ ۱ سے ۲۹۳ تک لکھا گیا ہے۔صفحہ ۲۹۱ پر مومن کی اردو غزل لکھی ہوئی ہے۔صفحہ ۲۹۲ پر قدسی کی فارسی غزل درج ہے اور آخر میں لکھا ہے نوشتہ ۱۲۷۳ھ۔صفحہ ۲۹۴ پر ''کبت'' درج ہے۔صفحہ ۲۹۵ پر امیر خسرو کا فارسی کلام درج ہے۔صفحہ ۱ سے ۳۶ تک دیوان سوز (اردو) لکھا گیا ہے۔جیسا کہ میں نے کہا ہر شاعر کے کلام کے بعد صفحے کا نمبر نیا شروع کیا گیا ہے۔دیوان سوز بھی ۱۲۷۳ ہجری کا لکھا ہوا ہے مگر صفحہ ۲۶ کو توجہ سے دیکھا جائے تو اس پر تاریخ کتابت ''۲۹۔شہر صفر المظفر ۱۲۷۳ھ بمقام کوتوالی، راجگڑھ لکھا ہوا ہے۔ ایک صفحے پر محمد عالمگیر بیگ کی مہر ۱۲۷۶ھ لگی ہوئی ہے۔اسی صفحے پر ۲۶ صفر المظفر ۱۲۷۳ھ بھی درج ہے اور اسی صفحے پر از قلم حقیر فقیر شہاب بیگ لکھا ہے۔اس سے پتا چلا کہ یہ بیاض شہاب بیگ کی لکھی ہوئی ہے۔ اسی کی ملکیت ہے۔بعد میں یہ محمد عالمگیر بیگ کے پاس آئی جس نے اس پر اپنی مہر ثبت کر دی۔یہ ہیں وہ تفصیلات جو ایک گھنٹہ مخطوطے کو دیکھ کر اس سے حاصل کی گئی ہیں۔اب آپ کے سوالوں کا جواب:-

۱۔ اس کا کاتب شہاب بیگ ہے۔

۲۔ یہ بیاض ۲۹۔شہر صفر المظفر ۱۲۷۳ھ بمقام کوتوالی، راجگڑھ میں مکمل ہوئی۔یہ ایک بیاض ہے اور باقاعدہ بیاض ہے جس میں صاحب بیاض نے دیوان نیاز اردو و فارسی، دیوان مرزا سودا، دیوان سوز، کبت وغیرہ اپنے ہاتھ سے نقل کیے ہیں۔

یہ بات تقابلی مطالعے سے معلوم ہو سکتی ہے کہ آیا یہ انتخاب ہے یا پورا دیوان نقل کیا گیا ہے۔[۶۸] لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ منتشر اوراق نہیں ہیں بلکہ باقاعدہ بیاض ہے۔

۳۔ یہ بات بغیر تقابلی مطالعے کے نہیں کہی جا سکتی کہ یہ مکمل دیوان سوز ہے یا دیوان سوز کا انتخاب ہے۔[۶۹] البتہ الف تا ی، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، بہ اعتبار حروف تہجی غزلیات نقل کی گئی ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ انتخاب/ دیوان کسی مخطوطے سے نقل کیا گیا ہے یا پھر اس سے انتخاب کیا گیا ہے۔میر سوز کے انتخاب مختلف اوقات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔مثلاً حسرت موہانی نے انتخاب میر سوز شائع کیا۔[۷۰] مولانا مبین چریاکوٹی نے

جواہر سخن میں میر سوز کا انتخاب دیا ہے۔[۱] اس بات کا جواب کہ اس انتخاب کا کیا ''امتیاز'' ہے بغیر تقابلی مطالعے کے نہیں دیا جا سکتا۔

جو باتیں میں نے مخطوطہ دیکھ کر نوٹ کی ہیں وہ اس خط کے ابتدائی حصے میں لکھ دی ہیں۔امید ہے کہ یہ معلومات آپ کے لیے مفید اور تحقیق میں معاون ہوں گی۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

بخدمت گرامی: دعا گو

جناب زاہد منیر عامر صاحب (دستخط) جمیل جالبی

شعبۂ اردو اورینٹل کالج (ڈاکٹر جمیل جالبی)

پنجاب یونیورسٹی لاہور ۵۴۰۰۰

﴿3﴾

صدر نشین

ڈاکٹر جمیل جالبی

تاریخ:۲؍دسمبر ۱۹۹۱ء

ذ۔۱۷۴۸

عزیزم، السلام علیکم

آپ کا خط ملا جس سے یہ معلوم ہوا کہ میرا بھیجا ہوا خط جس میں میں نے جامعہ پنجاب کی بیاض[۲] کے بارے میں تفصیلات فراہم کی تھیں، آپ کو مل گیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ امتحانات کی[۳] وجہ سے آپ میرے خط کی رسید نہیں دے سکے تھے۔

پچھلے دنوں میں کراچی گیا تھا اور دیوان میر سوز کو دیکھنے کے لیے ذرا سی دیر کے لیے اردو لغت بورڈ کراچی بھی گیا تھا۔ وہاں دیوان میر سوز کے دو نسخے ہیں۔ایک انڈیا آفس کے مخطوطے کی عکسی نقل ہے اور دوسرا دیوان میر سوز قلمی ہے۔جس کے کتاب سید میر ہیں اور تاریخ کتابت شہر جمادی الثانی روز سہ شنبہ ۱۱۴۵ ہجری درج ہے۔[۴]

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

بخدمت گرامی: آپ کا مخلص

جناب زاہد منیر عامر صاحب (دستخط) جمیل جالبی

شعبۂ اردو اورینٹل کالج (ڈاکٹر جمیل جالبی)

پنجاب یونیورسٹی لاہور ۵۴۰۰۰

﴿4﴾

صدر نشین

ڈاکٹر جمیل جالبی

تاریخ: ۱۶ر دسمبر ۱۹۹۱ء

ز-۱۷۶۳

عزیزم، السلام علیکم

ابھی ابھی آپ کا خط ملا۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ میں اسلام آباد میں ہوں [۵] اور یہ دونوں مخطوطے عکسی و قلمی اردو لغت بورڈ کراچی میں ہیں۔ دوسرا قلمی نسخہ جس کا ذکر میں نے اپنے خط میں کیا تھا وہ میر سوز کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ اگر اس سلسلے میں آپ کو مزید معلومات کی ضرورت ہو تو میرے حوالے سے لائبریرین اردو لغت بورڈ، ایس ٹی ۱۸۔اے، گلشن اقبال بلاک نمبر ۵، آف یونیورسٹی روڈ کراچی ۷۵۳۰۰ کو خط لکھ دیجیے۔ وہ جواب دیں گے۔ [۶] یہ لکھ دیجیے گا کہ میں نے کہا ہے۔ دیوان سوز کے بہت سے نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ان کی تفصیل مختلف کتب خانوں کی فہرستوں سے مل سکتی ہے۔ آج کل میں بہت مصروف ہوں اور کل رات ہی ماریشس سے واپس آیا ہوں۔ اس لیے مزید کچھ نہیں کہہ سکوں گا۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ خدا آپ کو اپنے کام میں کامیاب کرے۔

بخدمت گرامی: آپ کا مخلص

جناب زاہد منیر عامر صاحب (دستخط) جمیل جالبی

شعبۂ اردو، اورینٹل کالج (ڈاکٹر جمیل جالبی)

پنجاب یونیورسٹی لاہور ۵۴۰۰۰

﴿5﴾

۲۰
......
۹
......
۱۹۹۹ء

برادر عزیز۔ السلام علیکم

آپ کا خط ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ

یہ خبر پڑھ کر کہ آپ نے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کر لی ہے۔[۷] مجھے انتہائی خوشی ہوئی ۔میری طرف سے دلی اور بہت بہت مبارکباد قبول کیجیے۔ خدا کرے کہ آپ علم و ادب کی دنیا میں اپنے کام سے جھنڈے گاڑ دیں۔

جولائی ۱۹۹۹ء کا قومی ڈائجسٹ مجھے نہیں ملا۔ آپ اپنے مضمون کی ایک نقل مجھے بھجوا دیجیے۔[۸] میں پڑھ لوں گا۔ کاپی صاف ہو تو آسانی ہوگی۔ آج کل کیا کام کر رہے ہیں؟

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

مخلص

جمیل جالبی

﴿6﴾

۸
......
۱۰
......
۱۹۹۹ء

محترمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا اور ''چار موسم ایچی سن کالج میں'' کی تینوں قسطیں بھی۔ دونوں کے لیے شکر گزار ہوں۔

میں نے یہ قسطیں دیکھ لی ہیں۔ یہ ایسی مربوط ہیں کہ ان میں کسی قسم کے اضافے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے تحقیق کو تخلیق سے ملا کر ایک اچھا کام کیا ہے۔ میری طرف سے دلی مبارک۔ دعا ہے کہ آپ زندگی میں خوب خوب ترقی کریں اور اپنے کاموں سے علم و ادب کو مالا مال کریں۔ بس کام میں لگے رہیے اور اچھے اچھے کام کرتے رہیے۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

مخلص

جمیل جالبی

مکرر

اسے کتابی صورت میں جلد شائع کرا دیجیے۔ یہ تحریر تو اپجی سن کالج والوں کے لیے بھی باعثِ افتخار ہوگی۔ [۷۹]

﴿7﴾

۸
.....

۹
.....

۲۰۰۱ء

محترمی ڈاکٹر زاہد منیر عامر صاحب۔ سلام مسنون

گرامی نامہ ملا اور ساتھ ہی لمحے کی روشنی [۸۰] کا ایک نسخہ بھی۔ دونوں کے لیے شکر گزار ہوں۔

ماضی کو یاد کرنا، یاد رکھنا یا محفوظ کرنا اچھی بات ہے مگر ابھی آپ کا ماضی اتنا قریب ہے کہ لمحۂ موجود/ امروز میں رہنا مفید ہوگا۔ آپ کی تحریر میں دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ اسے بھی دلچسپی سے پڑھا۔

میر سوز کی سوانح اور شخصیت کی رسید کتاب پڑھ کر آپ کو دی تھی اور اورینٹل کالج کے پتے پر خط بھیجا تھا۔ معلوم ہوا کہ میرا خط گلے کی بھیڑ کی طرح شیر اُچک کر لے گیا [۸۱] کتاب مجھے مل گئی ہے۔ ضائع نہیں ہوئی۔ ضائع جو چیز ہوئی وہ آپ کے نام میرا خط تھا۔ خدا کرے یہ خط آپ کو مل جائے مگر پتا کیسے چلے۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

مخلص

جمیل جالبی

﴿8﴾

۱۶
.....
۹
.....

۲۰۰۲ء

برادر عزیز۔ سلام مسنون

میر سوز سوانح اور شخصیت کا ایک نسخہ کل ڈاک سے ملا جس کے لیے شکر گزار ہوں۔[۸۲] ان شاءاللہ جلد اس سے لطف اندوز ہوں گا۔

یہ خط رسید کے طور پر لکھ رہا ہوں تا کہ معلوم ہو جائے کہ کتاب مل گئی ہے۔ آپ سے بڑی امیدیں ہیں۔ کام میں لگے رہیے۔ ان شاءاللہ کامیاب ہوں گے۔

دعاؤں کے ساتھ

مخلص

جمیل جالبی

﴿9﴾

۲۷
.....
۱
.....

۲۰۰۳ء

عزیز محترم۔ السلام علیکم

آپ کی بھیجی ہوئی دو کتابیں: ترا عکس آئنوں میں[۸۳] اور جہات[۸۴] ملیں۔ ارمغان شیرانی[۸۵] مجھے ہاشمی صاحب نے دے دی تھی۔ میر سوز والی کتاب اس سے پہلے آپ نے بھجوائی تھی۔

اس خط کے ساتھ آپ کا تعارفی خاکہ اور نظموں کا مجموعہ (مسودہ) بھی ملا۔ میں آپ کی نظمیں دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں۔ اور اب یہ مطبوعہ مجموعہ ملا ہے تو اس سے بھی لطف اندوز ہوں گا۔

آپ کی خواہش ہے کہ میں آپ کے نئے مجموعے پر پیش لفظ لکھوں۔ میں ضرور لکھوں گا لیکن آپ کو خاصا انتظار کرنا پڑے گا۔ وجہ یہ ہے کہ میں گزشتہ آٹھ سال سے تاریخ ادب اردو کی تیسری جلد میں دھنسا ہوا ہوں [۸۶] اور فوری طور سے پیش لفظ لکھنا مشکل ہوگا۔ آپ خود صاحبِ قلم ہیں اس ذہن کا اندازہ کر سکتے ہیں جو تاریخ میں پوری طرح دھنسا ہوا ہو۔ بہر حال جیسا آپ فرمائیں۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

مخلص

جمیل جالبی

ڈاکٹر زاہد منیر عامر صاحب

﴿10﴾

۲۲ر جولائی ۲۰۰۳ء

محترم زاہد منیر عامر صاحب السلام علیکم

گرامی نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ ایک خط میں جو ہوسٹل کے پتے پر بھیجا گیا تھا [۸۷] میں نے ساری صورت حال سے آپ کو مطلع کر دیا تھا اور وہ خط بول کر لکھوایا تھا [۸۸] جنوری سے میں بیمار ہوں۔ دل کی سرجری ہوئی تھی اب آہستہ آہستہ ٹھیک ہو رہا ہوں۔ دماغ حاضر نہیں ہے۔ اس کے سفر واپسی میں کچھ وقت لگے گا۔ یہ مجموعۂ کلام تو بغیر مقدمہ ہی کے شائع کر دیجیے۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے اور مجھے بھی۔ ان شاء اللہ اگلے مجموعے پر یہ تحریر آ جائے گی۔ یار زندہ صحبت باقی

دعاؤں کے ساتھ

مخلص

جمیل جالبی

﴿11﴾

۱۵

.....

۱۰
.....
۲۰۰۴ء

محترمی زاہد منیر عامر صاحب۔ السلام علیکم

گرامی نامہ ملا اور ساتھ ہی چار موسم ایچی سن کالج میں کا ایک نسخہ بھی۔ دونوں کے لیے شکر گزار ہوں۔ [۸۹] خوب صورت بیان اور واقعیت کا امتزاج اس کتاب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ دعا ہے کہ علم و ادب کے میدان میں آپ خوب خوب ترقی کریں۔

میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ حال ہی میں واپس آیا ہوں۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

مخلص

جمیل جالبی

﴿12﴾

۱۵
.....
۱۲
.....
۲۰۰۴ء

برادر عزیز ڈاکٹر زاہد منیر عامر صاحب! السلام علیکم

گرامی نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ

میں نے چار موسم ایچی سن کالج میں کی رسید مختصر تاثرات کے ساتھ آپ کو ہوسٹل والے پتے پر جو خط پر درج تھا بھجوایا تھا۔ ایک خط آپ کے کسی خط کے جواب میں اورینٹل کالج کے پتے پر بھجوایا تھا۔ اب آپ سب سے پہلے مجھے یہ بتایئے کہ میں آپ کو خط کس پتے پر لکھوں۔ وہ پتا براہ کرم مجھے جلد بھجوا دیجیے تا کہ مجھے اطمینان ہو کہ خط آپ کو مل گیا ہے۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

مخلص جمیل جالبی

﴿13﴾

تقریش

ڈاکٹر زاہد منیر عامر کو میں برسوں سے جانتا ہوں، جب بھی اُن سے ملاقات ہوئی محسوس ہوا کہ وہ ہر لمحہ علم وادب کی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ دل لگا کر لگن سے کام کرتے ہیں اور جو کام کرتے ہیں اُس سے ان کی ذہانت ومحنت کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ ان کا سارا تعلیمی ریکارڈ ''درجہ اول'' سے بھرا ہوا ہے۔ ایم۔اے میں وہ فرسٹ کلاس فرسٹ آئے، پی ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لیے میر سوز کا کلیات مرتب کیا تو تجربہ کار محققوں نے بھی داد دی۔ طلائی تمغوں سے ان کا سینہ بھرا ہوا ہے۔ اب وہ پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں [۹۰] اور معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ کی کامیابیاں ان کی منتظر ہیں، وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کے متعدد تحقیقی وتنقیدی مقالے معیاری علمی و ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں ۔جہـــــات کے نام سے ان کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے اس میں ان کے تنقیدی، فکری اور تحقیقی مضامین شامل ہیں، ان کی فکر روشن اور قلم شگفتہ ہے۔

تحقیق وتنقید کے ساتھ وہ قابلِ توجہ شاعر بھی ہیں۔ نوجوان ہیں، اس لیے محبت کی شعاعیں ان کی زندگی کو منور رکھتی ہیں۔ وہ غزل سے زیادہ نظم کے شاعر ہیں، تـراعـکـس آئـنوں مـیں کے نام سے ان کی نظموں کا ایک مجموعہ آج سے چار پانچ سال پہلے شائع ہو چکا ہے جس میں دس بارہ غزلیں ہیں اور باقی سارا مجموعہ نظموں پر مشتمل ہے۔ جیسا میں نے کہا ''محبت'' ان کا بنیادی جذبہ ہے جو عام طور پر سماجی عوامل سے جڑا ہوا نہیں ہے۔ ان کی نظموں میں ایک آڑا ترچھا احساس ایک تخلیقی زاویے کو جنم دیتا ہے جس سے نظم روشن ہو جاتی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ جوان کا دوسرا مجموعہ ہے، [۹۱] صرف اور صرف نظموں پر مشتمل ہے ،ساری نظمیں پہلے مجموعے کی نظموں کی طرح ،آزاد نظمیں ہیں ۔اس مجموعے میں ان کی قوتِ اظہار نے ایک اور منزل سر کی ہے جس سے ان کے شعری ارتقا کا نیا روپ سامنے آتا ہے۔ یہاں بھی ''زندہ محبت'' ان کی نظموں میں تازگی کو جنم دیتی ہے اور اسے خوشبو میں بدل دیتی ہے۔ زاہد منیر عامر کی شاعری جذبہ واحساس کی شاعری ہے جس میں خلوص اور معصومیت نے اثر وتاثیر کو جنم دیا ہے۔ اب خیر سے وہ چالیس سال کے ہونے والے ہیں، مجھے یقین ہے کہ اب ان کی شاعری ایک اور کروٹ بدلے گی اور محبت میں ''فکر'' کا عنصر شامل ہو کر گہرائی کو جنم دے گا اور ان کا قلم رُک رُک کر شاعری کرے گا۔ ان کی بعض نظمیں پڑھ کر گاہ گاہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خواب کی حالت میں ہیں۔ وہ خواب جو لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں سے شعور کی سطح پر آ کر ان کی شاعری میں رنگ گھولتے ہیں۔ یہی خواب زندگی ہیں اور یہی زندگی تخلیق کا ثمر ہے۔

اس نئے مجموعے کی اشاعت پر میں زاہد منیر عامر کو مبارک باد دیتا ہوں۔

بملاحظہ ڈاکٹر جمیل جالبی

ڈاکٹر زاہد منیر عامر ۲۸/اگست ۲۰۰۵ء

لاہور

ملنے پر رسید ضرور دیجیے، فوراً

جمیل جالبی

﴿14﴾

۸

.....

۹

.....

۲۰۰۵ء

محترمی زاہد منیر عامر صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا خط ملا جس کے لیے شکر گزار ہوں۔ آپ نے جو کاغذات مجموعۂ کلام کے ساتھ بھیجے تھے ان میں آپ نے اپنا عہدہ اسسٹنٹ پروفیسر ہی لکھا تھا اور وہی میں نے لکھ دیا۔ ایسوسی ایٹ پروفیسر ہونے کی خوش خبری آپ نے آج سنائی ہے۔ سو مبارک باد۔ آپ [اسے] اپنے قلم سے درست کر دیجیے۔ لفظ تقریش میں نے وضع کیا ہے جس سے مراد وہ پیش لفظ ہے جس میں تقریظ کا پہلو نمایاں ہو۔ اگر آپ کو پسند ہے تو اسے برقرار رکھیے ورنہ کاٹ کر پیش لفظ لکھ دیجیے۔ ۹۲

تاریخ جامعہ پنجاب کا کوئی نسخہ مجھے نہیں ملا حالانکہ میں اسے پڑھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میری طرف سے وی سی صاحب سے گزارش کر دیکھیے۔ امید ہے وہ اجازت دے دیں گے ۹۳ آپ مجھے عزیز ہیں اور میں آپ کو علم و ادب کی دنیا میں روشن ستارہ بن کر چمکتا ہوا دیکھنے کا خواہش مند ہوں۔ خدا آپ کو صحت مند و سلامت رکھے۔

دعاؤں کے ساتھ

دعا گو

جمیل جالبی

حواشی

۱ ممتاز مفتی اوکھے اولڑے لاہور: فیروز سنز ۱۹۹۵ء ص ۱۵۷

۲ ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادب اردو لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۸۷ء جلد دوم (اٹھارویں صدی) صص ۹۵۔ ۹۷

۳ زاہد منیر عامر مولانا ظفر علی خان ..... کتابیات اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۹۳ء

۴ ڈاکٹر جمیل جالبی اردو تحقیق کی روایت ایک مصاحبہ ادبی تحقیق، لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۹۴ء ص ۳۸

۵ ڈاکٹر جمیل جالبی پاکستانی کلچر۔ قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ کراچی: الیٹ پبلشرز لمیٹڈ ۱۹۷۳ء (پہلی اشاعت ۱۹۶۴ء)

۶ ۱۹۸۴ء و ۱۹۸۶ء

۷ پروفیسر عزیز احمد برصغیر میں اسلامی کلچر ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ ۱۹۹۰ء

۸ پاکستانی کلچر۔ قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ ص ۱۴

۹ ۱۹۸۹ء

۱۰ ڈاکٹر جمیل جالبی برصغیر میں اسلامی کلچر لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ ۲۰۰۵ء ص ۱، ۲

۱۱ جامعہ کراچی کے شعبہ علوم ابلاغیات کے سابق سربراہ اور راقم کے دوست پروفیسر ڈاکٹر طاہر مسعود جالبی صاحب کے پبلک ریلشنز آفیسر بھی رہے، انھوں نے تحریر فرمایا ہے:

''..... مجھے انھوں نے ہدایت کی کہ پریس کانفرنس میں پڑھنے کے لیے ان کی تقریر تیار کردوں (جالبی صاحب ہمیشہ لکھی ہوئی تقریر پڑھنے کے عادی رہے بہت بعد میں وہ تقریر پڑھنے کے بعد تھوڑی بہت گفتگو زبانی کرلیا کرتے تھے)

اوراق ناخواندہ کراچی: ہما پبلشنگ ہاؤس ۲۰۱۶ء ص ۸۵

۱۲۔ نوشابہ صدیقی چشم حیراں کراچی: اکادمی بازیافت ۲۰۱۹ء ص ۱۹

۱۳۔ ڈاکٹر جمیل جالبی پیش لفظ فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ جلد اوّل، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبا ن ۱۹۹۱ء صفحہ ج، د

۱۴۔ ڈاکٹر جمیل جالبی پاکستان میں ذریعہ ء تعلیم کا مسئلہ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۔۔ ۱۹۹۳ء ص ۱۴

۱۵۔ ایضاً ص ۱۴

۱۶۔ ایضاً ص ۵

۱۷۔ ایضاً ص ۷

۱۸۔ ایضاً ص ۱۶

۱۹۔ ایضاً ص ۱۲

۲۰۔ ارسطو بوطیقا مترجمہ عزیز احمد کراچی: انجمن ترقی اردو ۱۹۸۶ء ص ۲۶

۲۱۔ ایضاً ص ۲۹

۲۲۔ ایضاً ص ۳۶

۲۳۔ ڈاکٹر طاہر مسعود یہ صورت گر کچھ خوابوں کے کراچی: ہما پبلشنگ ہاؤس ۲۰۱۷ء ص ۴۵۸

۲۴۔ ڈاکٹر عطش درانی در بوطیقا ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۹۸ء ص ۶

۲۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ارسطو سے ایلیٹ تک اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن ۱۹۸۸ء (یہ کتاب پہلی بار ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی) ص ۸۴

۲۶۔ ارسطو بوطیقا ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۹۸ء ص ۲۹

۲۷۔ ایضاً ص ۴۸

۲۸۔ ایضاً ص ۲۲

۲۹۔ یہ صورت گر کچھ خوابوں کے ص ۴۵۸

۳۰۔ ارسطو سے ایلیٹ تک ص ۱۱۸

۳۱۔ ارسطو شعریات مترجمہ شمس الرحمٰن فاروقی دہلی: ترقی اردو بیورو ۱۹۸۰ء ص ۸۱

۳۲ *The Poetics of Aristotle;* translated from Greek into English and from Arabic into Latin. Hodder and Stoughton, 1911

۳۳ شعریات دیباچہ ص۷

۳۴ شعریات ص۸

۳۵ M.A Enan *Ibn Khaldun His life and work* Islamabad: Services Book Club1986 Page 67

۳۶ *Op- Cit*

۳۷ مولوی صاحب کا یہ خط سیّد ہاشمی فرید آبادی کے نام ہے اور ہنوز کہیں شائع نہیں ہوا ہے۔ راقم کی اس خط تک رسائی ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کی عنایت سے اس مضمون کی صورت میں ہوئی جو انھوں نے شعبہ اردو پنجاب یونی ورسٹی کے تحقیقی مجلّے باز یافت میں اشاعت کے لیے ارسال فرمایا ہے۔

۳۸ ڈاکٹر وحید قریشی مقالات تحقیق لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۱۹۸۸ء ص۳۳و۳۵

۳۹ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں اس خطی نسخے کا نمبر ۸۷۰۸ /۱۳۔۸۹۱ ج ۸۷۱ د

۴۰ ڈاکٹر وحید قریشی (مرتب) دیوان جہاندار لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۶۶ء ص۳

۴۱ فخر دین نظامی مثنوی نظامی دکنی مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی کراچی: انجمن ترقی اردو صفحہ ز تا ح

۴۲ عبدالحق نصرتی کراچی: انجمن ترقی اردو طبع ثانی ۱۹۶۱ء

۴۳ عابد رضا بیدار تدوین متن کے مسائل خدا بخش سیمینار پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری ۱۹۸۲ء ص۳ موصوف کی پوری عبارت ملاحظہ ہو: ''مقدمہ میں متن کے مرتب کی طرف سے تدوین شدہ نسخے اور اس کے مصنف کے بارے میں ضروری اور ناگزیر نکات کے سوا کچھ بھی پیش کرنا علمی غیر دیانت داری کے ساتھ ساتھ اخلاقی جرم بھی ہے۔ مقدمہ نگار کو ہر نکتہ پیش کرتے وقت یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ اس مخصوص نکتے کی ایسی اہمیت ہے جو بن لکھا رہ گیا تو اس میں تدوین کی تفہیم و تحسین کا حق ادا نہیں ہو پائے گا۔ مقدمہ کو to the point اور مختصر ہونا چاہیے''

۴۴ ڈاکٹر جمیل جالبی دیوان حسن شوقی کراچی: انجمن ترقی اردو ۱۹۷۱ء ص۳۰

۴۵ ایضاً ص۴۸

۴۶ ایضاً ص۲

۴۷ ایضاً ص۴۸

۴۸ جمیل جالبی مقدمہ،دیوان نصرتی لاہور:قوسین ۱۹۷۶ءص۱۴

۴۹ دیوان نصرتی ص ۷۹،۸۰

۵۰ لچھمی نرائن شفیق شام غریبان مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی،کراچی:انجمن ترقی اردو۱۹۷۷ء ص۲۱۶

۵۱ شام غریبان ص۲۱۷

۵۲ غالب،خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر مکتوب۲۱ لاہور:مجلس یادگار غالب، پنجاب یونی ورسٹی ۱۹۶۹ء جلد اول ص۲۷۳

۵۳ ایضاً ص۲۷۵

۵۴ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

خطوط غالب مرتبہ منشی مہیش پرشاد حاشیہ ص۳۴۳ بحوالہ خطوط غالب مرتبہ مہر محولہ بالا ص۲۷۳

۵۵ خطوط غالب جائے مذکور

۵۶ خطوط غالب جلد اول ص۲۷۷

۵۷ محمد قہرمان مقدمہ تصحیح و تعلیقات،دیوان حاجی محمد جان قدسی مشہدی مشہد:انتشارات دانشگاہ فردوسی،مشہد ۱۳۷۵

۵۸ رشید حسن خان ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ لاہور:الفیصل ناشران ۱۹۸۹ء صص ۲۸۹۔۔۳۵۰

۵۹ مشفق خواجہ اردو ادب کی پہلی تاریخ در ڈاکٹر جمیل جالبی-- بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا مرتب ڈاکٹر محمد خاور جمیل کراچی:الیٹ پبلشرز ۲۰۱۶ء صص ۵۶۷۔۔۵۸۱

۶۰ ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادب اردو،لاہور:مجلس ترقی ادب ۱۹۸۷ء ج۲،ص۷۹۴

۶۱ حسرت موہانی ارباب سخن،اوّل و دوم لکھنو:اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۲ءص۴

۶۲ زاہد منیر عامر کلیات میر سوز لاہور:مجلس ترقی ادب ۲۰۱۵ء جلد دوم ص۲۹۳ نیز اس حوالے سے راقم کا نوٹ ص۴۶۲

۶۳؎ شاہد احمد دہلوی گنجینہ گوہر کراچی: مکتبہ اسلوب س۔ن ص ۲۱۰

۶۴؎ ارسطو سے ایلیٹ تک ،پیش لفظ

۶۵؎ نوجوان نسل کے فکری اور جذباتی مسائل پر راقم کی ایک کتاب جو نیشنل بک کونسل آف پاکستان کے تعاون سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔

۶۶؎ راقم کی ایک اور کتاب جو اسی زمانے میں شائع ہوئی۔ لاہور: گلوب پبلشرز ۱۹۸۹ء

۶۷؎ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا راقم نے جالبی صاحب سے اس بیاض کے دیکھنے اور اس پر رائے دینے کی فرمائش کی تھی۔ وہ ازرہ کرم اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں تشریف لے گئے اور اس بیاض کو ملاحظہ فرما کر اس کے بارے میں اپنے مشاہدات اس خط کی صورت میں ارقام فرمائے۔

۶۸؎ پورا دیوان نہیں یہ محض انتخاب ہے۔

۶۹؎ ایضاً مکمل دیوان نہیں حسب دستور تمام ردیفوں سے انتخاب کیا گیا ہے۔

۷۰؎ دیوان سوز مرتبہ سیّد فضل الحسن حسرت موہانی بی اے، ایڈیٹر اردوئے معلّٰی علی گڑھ۔ اس کتابچے میں صفحہ ایک سے آٹھ تک مرتب کا مقدمہ ہے۔ اس کے بعد: ''میر سوز کا حال'' درج ہے اور پھر ردیف وار انتخابِ غزلیات، آخر میں متفرقات۔ قطعات سوز پر وضاحت کی گئی ہے؛ ماخوذ از تذکرۂ جلوۂ خضر مؤلّفہ

صفیر بلگرامی۔ غزلیات متفرق از چمنِ بے نظیر مطبوعہ بمبئی۔ غزلیات سوز ماخوذ از ضمیمہ اخبار قدیم کارنامہ لکھنؤ از مخمسات مرزا خانی نوازش۔ غزلیاتِ سوز از مجمع الاشعار (دو غزلیں) تعداد صفحات: ۳۲۔ یہی انتخاب حسرت موہانی کی انتخاب سخن (لکھنو: اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۳ء) جلد چہارم صفحہ ۱۸۳ تا ۲۱۰ پر شامل ہے۔ فرق یہ ہے کہ کتابچے میں ہر حصے کے محوّلہ بالا ماخذ بھی درج ہیں جبکہ انتخاب سخن میں انھیں حذف کر دیا گیا ہے۔ دیکھیے کلیات میر سوز لاہور: مجلس ترقی ادب ۲۰۰۷ء جلد اول صص ۳۹۔۴۰

۷۱؎ محمد مبین کیفی چریاکوٹی جواہر سخن الہ آباد: ہندوستانی اکیڈمی ۱۹۳۵ء جلد دوم

۷۲؎ شہاب بیگ کی محولہ بالا بیاض ۔

۷۳؎ ان دنوں راقم ایم اے اردو کے حتمی امتحانات میں مصروف تھا۔

۷۴؎ انڈیا آفس کے مخطوطے کی نقل مجھے مل گئی تھی۔ اردو لغت بورڈ میں موجود خطی نسخے کی نقل بھی

بعد میں حاصل کر لی گئی جس کا تعارف راقم کی کتاب کلیات میر سوز جلد اول (طبع لاہور ۲۰۰۷ء) میں مندرج ہے۔ دیکھیے صفحہ ۳۲

۷۵ ہندوستان سے آنے کے بعد جالبی صاحب کا قیام کراچی میں رہا سوائے اس زمانے کے جب وہ بہ سلسلہ ملازمت لاہور یا اسلام آباد میں مقیم ہوئے۔

۷۶ اردو لغت بورڈ میں جالبی صاحب کے حوالے سے خط لکھا گیا جہاں سے مندرجہ ذیل جواب موصول ہوا

۱۲ر جنوری ۱۹۹۲ء

مکرمی! السلام علیکم۔ آپ کا گرامی نامہ دیوان میر سوز کے عکسی نسخہ کے بارے میں موصول ہوا۔ اس سلسلے میں جو معلومات آپ کو درکار ہیں وہ بہت ٹیکنیکل ہیں اور خطی نسخہ کا پڑھا بھی آسان نہیں ہے۔ اس لیے آپ کی مطلوبہ معلومات فراہم نہ کر سکنے پر شرمندہ ہوں۔ ویسے جب کبھی آپ کراچی آئیں تو بورڈ کے کتب خانے میں تشریف لا کر یہ نسخہ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ آپ کی مطلوبہ معلومات فراہم نہ کر سکنے پر ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں۔ والسلام۔ فاطمہ قدسیہ نقوی (لائبریرین)

۷۷ پی ایچ ڈی کی تکمیل ۱۹۹۸ء میں ہوئی اور باقاعدہ آرڈرز ۳ر ستمبر ۱۹۹۹ء کو جاری ہوئے۔

۷۸ راقم کی کتاب چار موسم ایچی سن کالج میں کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے قسط وار ماہ نامہ قومی ڈائجسٹ میں شائع ہوتی رہی۔ یہ انھی اقساط کا ذکر ہے جو جالبی صاحب کی خدمت میں ارسال کی گئیں۔

۷۹ یہ اقساط مرتب ہو کر ۲۰۰۴ء میں عنوان بالا کے تحت کتابی صورت میں شائع ہو گئیں۔ ناشر ملک اینڈ کمپنی لاہور

۸۰ مطبوعہ لاہور: اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی سنہ ۲۰۰۰ء

۸۱ شیر کا خط تھا شیر ہی لے جا سکتا تھا

۸۲ پچھلے خط مرقومہ ۸ر ستمبر ۲۰۰۱ء میں بھی اس کتاب کے ملنے کا ذکر ہے؟ دیکھیے مکتوب نمبر ۷

۸۳ راقم کے دوسرے شعری مجموعے کا نام ہے، شائع کردہ خزینہ علم و ادب لاہور ۲۰۰۰ء

۸۴ راقم کے مقالات کا مجموعہ جو پنجاب یونی ورسٹی نے شائع کیا۔ لاہور: کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ پنجاب یونی ورسٹی ۲۰۰۰ء

۸۵ نام ور محقق حافظ محمود خان شیرانی کی یاد میں راقم اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کا مرتب

کردہ ارمغان علمی جسے شعبہ اردو پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے ۲۰۰۱ء میں شائع کیا گیا۔صفحات ۳۲۸

۸۶ تاریخ ادب اردو کی یہ جلد بیسویں صدی کے نصف اول تک کے دور کا احاطہ کرتی ہے اور بحمداللہ پایہ تکمیل کو پہنچ کر جون ۲۰۰۶ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہوگئی۔

۸۷ یعنی پنجاب یونی ورسٹی نیو کیمپس کا ہاسٹل نمبر سات جہاں اس وقت راقم الحروف سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے مقیم تھا۔

۸۸ غالباً یہ خط مجھے نہیں ملا کیونکہ میرے پاس جو خطوط موجود ہیں وہ جالبی صاحب کے اپنے دست وقلم کا نتیجہ ہیں۔

۸۹ دیکھیے حوالہ نمبر ۳۵، ۳۶

۹۰ جیسا کہ اگلے خط سے وضاحت ہوگی جالبی صاحب نے یہاں اسسٹنٹ پروفیسر لکھ دیا تھا جسے ان کی ہدایت پر درست کیا گیا۔راقم ۲۳/اپریل ۲۰۰۵ء سے ایسوسی ایٹ پروفیسر ہو چکا تھا۔

۹۱ دراصل یہ راقم کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔پہلا مجموعہ ۱۹۸۹ء میں پہلی سحر کے رنگ کی عنوان سے شائع ہوا تھا دوسرا تراعکس آئنوں میں ۲۰۰۰ میں شائع ہوا، جالبی صاحب نے تیسرے مجموعے کے لیے یہ تحریر لکھی، دیکھیے: نظم مجھ سے کلام کرتی ہے (لاہور: تناظر مطبوعات ۲۰۰۶ء)۔

۹۲ راقم نے جالبی صاحب کے دیے ہوئے اس اختیار کو استعمال نہیں کیا ان کے قلم نے جو لکھا تھا اسی کو برقرار رکھا کہ یہ جالبی صاحب کا ایک انداز تھا وہ بعض اوقات خود سے لفظ گھڑ لیا کرتے تھے جیسے انھوں نے میر کے نکات الشعرا کے لیے ''تحقیدی تذکرہ'' کی ترکیب استعمال کی جو انھوں نے تحقیق اور تنقید کو ملا کر بنائی تھی۔اسی طرح یہاں تقریظ اور پیش لفظ کو ملا کر تقریش بنا ڈالا۔راقم اس حوالے سے اپنے ایک مضمون میں اظہار خیال کر چکا ہے۔فہو ھذا:

.....اس مرحلے پر ندیم صاحب نے احقر کے مسودے میں موجود محترم ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے دیباچے کے عنوان کی بابت استفسار کیا.....محترم جالبی صاحب نے اپنے دیباچے کا عنوان ''تقریش'' درج کیا تھا جب ان کا دیباچہ موصول ہوا تو احقر نے اس لفظ کا مطلب جاننے کے لیے لغات سے رجوع کیا لیکن کہیں اس لفظ کا اندراج نہ پا کر جالبی صاحب کی خدمت میں راہ نمائی کی درخواست کی گئی۔انھوں نے فرمایا کہ میں نے تقریظ اور پیش لفظ کو ملا کر یہ نیا لفظ وضع کیا ہے.....ندیم صاحب کے استفسار پر، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انھوں نے احقر کی نظموں کے مسودے کو غور سے پڑھا ہے، جالبی

صاحب کا جواب عرض کیا گیا، جس پر ندیم صاحب نے فرمایا کہ اس سے پہلے بھی جالبی صاحب نے ایک ایسا ہی لفظ گھڑا تھا جس پر مجھے ہندوستان سے فون آیا کہ جالبی صاحب سے کہیے کہ یہ لفظ درست نہیں ہے.....احقر نے وضاحت کی کہ وہ لفظ ''تحقید'' تھا جو جالبی صاحب نے اپنی کتاب ادبی تحقیق میں میر کے تذکرے نکات الشعرا کے لیے استعمال کیا ہے اور یہ لفظ انھوں نے تحقیق اور تنقید کو ملا کر وضع کیا ہے، وہ کتاب مجلس ترقی ادب ہی سے شائع ہوئی ہے، خود ندیم صاحب کے ردِعمل سے ان الفاظ کے لیے پسندیدگی ظاہر نہیں ہو رہی تھی، احقر نے اس موقع پر مزید کچھ کہنے سے گریز کیا۔ ویسے عربی قاعدے کی رو سے یہ الفاظ باب تفعیل میں جاتے ہیں اور وہاں تقریش کا معنی قریشی بنانا اور تحقید کا معنی نفاق پیدا کرنا ہو جاتا ہے۔ ندیم نما، احمد ندیم قاسمی کے خطوط در تخلیقی ادب، اسلام آباد: نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ۲۰۰۷ء شمارہ ۴

۹۳ تاریخ جامعہ پنجاب کی طباعت اور اس کے بعد اشاعت کی ایک طویل کہانی ہے اس کے بعض کردار اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔ یہ کہانی کسی مناسب موقعے پر نذر قارئین کی جائے گی۔

☆☆☆☆☆

ضمیمہ: جالبی صاحب کے نام راقم کے دو خط مربوط بہ مکاتیب دوم و چہارم

.....

لاہور

۹۱/۱۱/۲۰ء

مخدوم گرامی! السلام علیکم

آپ کا شفقت نامہ، جس میں آپ نے شہاب بیگ کی بیاض سے متعلق معلومات اور اپنی رائے سے مطلع فرمایا تھا جن دنوں ملا میں امتحانات میں الجھا ہوا تھا پھر چند در چند اسفار پیش آ گئے۔ اب میں لاہور میں آ کر قیام کے قابل ہوا ہوں تو یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ تاخیر کی معذرت چاہتا ہوں۔

آپ نے عند الملاقات سوز کے دیوان کے اس مخطوطے کا ذکر فرمایا تھا جو آپ کے ارشاد کے مطابق ''آصف جاہ'' کے کتب خانہ کے لیے خریدے جانے والے مخطوطوں میں شامل تھا۔ میں آج کل میر سوز کے جس مخطوطے پر کام کر رہا ہوں وہ برٹش میوزیم لندن میں ہے۔ اس کی مائیکرو فلم پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔ میری تحقیق کی بنیاد یہی فلم ہے میں نے اپنی سی کاوش کے بعد اس کے

اوّلین دوصفحات پر مندرج جومعلومات نوٹ کی ہیں ان کے مطابق یہ مخطوطہ (جس کی فلم پیش نظر ہے) ۱۲۶۲ھ میں لکھا گیا۔ کتابت کی تاریخ کا اسلوب یہ اشتباہ پیدا کرتا ہے کہ اس سنہ میں اس پر غالباً نظر ثانی کی گئی ملاحظہ ہو

''بتاریخ نہم ربیع الاول ۱۲۶۲ ہجری بجائزہ رسید''

دیوان میر سوز ۱۷۵ ورق

تین مہروں میں سے ایک مہر پڑھی جاسکی ہے جس کی عبارت کچھ یوں ہے:

خوش است مہر کتب خانہ سلیمان جاہ

[بہر] کتاب مزین چو نقش بسم اللہ (؟) نمبر ۳۱۶

ایک دستخط بھی ثبت ہیں جو بہت شکستہ ہیں ''منشی محمد'' ..... اور ''عفی عنہ'' پڑھا جاتا ہے بیچ کا حصہ غالباً ''شفیع'' یا ''علی'' ہے۔

ایک مہر برٹش میوزیم لندن کی ہے، برٹش میوزیم کے اندراجات میں Place & Date of Origin کا خانہ خالی چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس نسخے کا خط نہایت عمدہ ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نالائق ہے اور اسے وزن کا بالکل شعور نہیں ہے۔

یہ تفصیلات اس لیے تحریر کی ہیں کہ آپ ان کی روشنی میں مجھے بتاسکیں گے کہ آپ کے ارشاد فرمودہ نسخے اور اس نسخے میں کیا تطابق یا تخالف ہے؟ اور یہ کہ اگر یہ نسخہ آپ کے علم میں ہے تو اس کی بابت کوئی اور تفصیل جو آپ بتانا پسند کریں، اس سے مجھے ضرور آگاہ فرمادیں۔ نوازش ہوگی۔ چربا کوٹی کا انتخاب تلاش کررہا ہوں۔ غلام حسین صاحب نے بھی میر سوز کا ایک انتخاب کیا ہے جو اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو سے سنہ ۸۳ء میں شائع ہوا۔ کسی وقت اسے بھی دیکھ لیتا ہوں۔

کیا اردو لغت بورڈ کراچی میں موجود میر سوز، کے دیوان کے مخطوطے کی فوٹو کے حصول میں آپ کچھ مدد فرماسکیں گے؟

زحمت دینے کی معذرت چاہتا ہوں۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

نیازمند

زاہد منیر عامر

.....

لاہور

۷/دسمبر۹۱ء

مخدوم گرامی! السلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ آج ہی موصول ہوا۔ممنون ہوں کہ آپ نے کراچی جا کر میری گزارش کو یاد رکھا اور لغت بورڈ میں مخطوطات ملاحظہ فرمائے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزا

بلوم ہالٹ کی فہرست میں دیوان میر سوز کے جس مخطوطے کا ذکر ہے اس کی تاریخ کتاب ۱۴/ جمادی الثانی ۱۲۱۶ھ ہے جب کہ میرے زیر تحقیق مائیکرو فلم والے مخطوطہ پر نہم ربیع الاول ۱۲۶۲ھ کی تاریخ درج ہے (اس تاریخ سے متعلق، گزشتہ خط میں میرا سوال آپ کی توجہ سے محروم رہا ہے جب کہ اس فلم پر برٹش میوزیم کی مہر موجود ہے اور وہاں اس کا اندراج نمبر DR380 ہے Order P.S.O/4111

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انڈیا آفس/ برٹش میوزیم میں میر سوز کے دیوان کے دو مخطوطے موجود ہیں۔آپ نے اپنے گرامی نامہ میں لکھا ہے کہ لغت بورڈ میں ''انڈیا آفس کے مخطوطے کی عکسی نقل ہے'' براہ کرم مطلع فرمائیں کہ یہ کسی نسخے کی نقل ہے اور یہ عکسی نقل فوٹو سٹیٹ ہے یا مائیکرو فلم؟ دوسرا قلمی نسخہ جس کا آپ نے ذکر فرمایا ہے، کیا میر سوز کا لکھا ہوا ہے؟ کیونکہ میرے علم میں ایک ایسا نسخہ بھی آیا ہے جو میر سوز کا انتخاب کردہ ہے اس کے آغاز میں ''لمحرّرہ سید محمد میر سوز'' لکھا ہوا ہے، اس نسخے کی پہچان اس کا نہایت خوش خط ہونا ہے کیونکہ میر سوز نستعلیق اور شفیعا میں کمال دسترس رکھتے تھے۔کیا یہ وہی نسخہ تو نہیں ہے؟ اس ضمن میں ایک اور گزارش یہ ہے کہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے فورٹ ولیم کالج کی، سوسائٹی کے کتب خانہ میں موجود مطبوعات کی، جو فہرست شائع کی تھی ان میں، دیوان سوز کا بھی ذکر ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ دیوان (انتخاب) فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں بھی شامل رہا۔لیکن اس فہرست سمیت کسی ذریعے سے نہ تو اس کے مرتب و مدون کا نام پتہ چلتا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی نسخہ کہیں دستیاب ہو رہا ہے۔ خیال تھا کہ نیشنل آرکائیوز انڈیا کے ذخیرہ مطبوعات فورٹ ولیم کالج میں اس کا کوئی نسخہ موجود ہوگا لیکن وہاں بھی نہیں ہے۔اگر آپ کے علم میں اس کا کوئی نسخہ ہو، یا آپ اس کی دیگر تفصیلات سے آگاہ ہوں تو ازراہ کرم ضرور مطلع فرمائیں۔(جائزہ مخطوطات اردو میں

مندرجہ تفاصیل میرے علم میں ہیں)

۳۔ قاضی عبدالودود صاحب کے ایک ذاتی (غیر مطبوعہ) نوٹ سے دیوان سوز کے ایک نسخہ اعلی حیدر کی اطلاع ملی ہے لیکن اس نوٹ سمیت کسی اور ذریعے سے اس نسخے کی کوئی تفصیل بہم نہیں پہنچ رہی۔ اگر اس سلسلہ میں بھی آپ کے علم میں کوئی تفصیل ہو تو مطلع فرما دیجیے۔ مجھے احساس ہے کہ میری یہ طول کلامی آپ کی مصروفیات کے حوالے سے مطلوب اختصار سے متجاوز ہے لیکن امید ہے کہ آپ اسے محسوس نہیں فرمائیں گے اور اپنی شفقت و تعاون سے نوازیں گے۔ امید ہے آپ بعافیت ہوں گے۔

والسلام علیکم ورحمة اللّٰہ برکاتہ

☆☆☆